تدبّرِ قرآن

۵۷

الحدید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

یہ سورہ سابق سورہ ——— الواقعۃ ——— کی مثنیٰ ہے۔ اگرچہ دونوں میں مکی اور مدنی ہونے کے اعتبار سے فی الجملہ زمانی اور مکانی بُعد ہے لیکن معنوی اعتبار سے دونوں میں غایت درجہ ربط و اتصال ہے۔ سابق سورہ میں یہ اصولی حقیقت واضح فرمائی گئی ہے کہ جزاء و سزا کا دن لازماً آ کے رہے گا اور اس دن لوگ تین گروہوں میں تقسیم ہو جائیں گے۔ ایک گروہ سابقون اوّلون کا ہو گا، دوسرا اصحاب یمین کا، تیسرا اصحاب شمال کا۔

اس سورہ میں خاص طور پر مسلمانوں کو مخاطب کر کے ان کو سابقین اوّلین کی صف میں اپنی جگہ پیدا کرنے پر ابھارا ہے اور اس کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ فتح مکہ سے پہلے پہلے جو لوگ جہاد و انفاق کریں گے وہ سابقین کے زمرے میں شامل ہوں گے اور ان کا مرتبہ ان لوگوں سے اونچا ہو گا جو فتح مکہ کے بعد جہاد و انفاق کی سعادت حاصل کریں گے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ دونوں ہی سے اچھا ہے تاہم تقرب الٰہی کے اعتبار سے دونوں میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔ اسی ضمن میں ان مسلمانوں کو جہاد و انفاق پر ابھارا ہے جو اسلام میں داخل تو ہو گئے تھے لیکن ایمان کے مقتضیات سے اچھی طرح آشنا نہ ہونے کے سبب سے، اس کے مطالبات پورے کرنے کے معاملے میں کمزور تھے۔ ان کو تنبیہ فرمائی ہے کہ اگر دنیا کی محبت میں پھنس کر تم نے آخرت کی ابدی بادشاہی حاصل کرنے کا حوصلہ کھو دیا تو یاد رکھو کہ بالآخر یہود کی طرح تمہارے دل بھی سخت ہو جائیں گے اور تمہارا انجام وہی ہو گا جو ان کا ہوا۔

اس معنوی ربط کے ساتھ ساتھ دونوں سورتوں میں ظاہری ربط بھی نہایت واضح ہے۔ سابق سورہ کا خاتمہ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيمِ کے الفاظ پر ہوا ہے اور اس کا آغاز سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ... الآیۃ کے الفاظ سے ہوا ہے۔ گویا اُس کی آخری اور اِس کی پہلی آیت نے ایک حلقۂ اتصال کی شکل اختیار کر کے دونوں کو نہایت خوبصورتی سے باہم دگر مربوط کر دیا ہے۔ اس قسم کے ربط کی نہایت خوبصورت مثالیں پیچھے بھی گزر چکی ہیں اور یہ قرآن کے ایک منظّم و مربوط کتاب ہونے کا ایک واضح قرینہ ہے۔

ب۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

(۱-۶) سورہ کی تمہید جس میں اللہ تعالیٰ کی صفاتِ عزّت، حکمت، قدرت، علم، خلق اور تدبیر کی طرف ایک جامع اشارہ ہے جس سے مقصود اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ جو ان صفات سے متّصف ہے وہی آخرت میں سب کا مرجع و مولیٰ بھی ہو گا اس وجہ سے وہی حمد و تسبیح کا سزاوار ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز اسی کی تسبیح کر رہی ہے اور اپنے عمل سے انسانوں کو بھی دعوت دیتی ہے کہ وہ بھی اسی کی بندگی کریں اور اس بندگی میں کسی اور کو اس کا شریک نہ بنائیں۔

(۷-۱۰) مسلمانوں کو عموماً اور ضعیف الایمان مسلمانوں کو خصوصاً یہ تنبیہ کہ رسول سے سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کا جو عہد انھوں نے کیا ہے اس کے تقاضے عزم و ہمت سے پورے کریں۔ آج اللہ کا رسول جہاد و انفاق کی جو دعوت دے رہا ہے اس پر لبیک کہنا ایمان کا بدیہی تقاضا ہے۔ یہی چیز لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لائے گی۔ جو لوگ آج انفاق و جہاد کریں گے ان کا مرتبہ ان لوگوں سے اونچا ہو گا جو اس وقت جہاد و انفاق کریں گے جب مکّہ فتح ہو جائے گا۔ اگرچہ ان سے بھی اللہ تعالیٰ کا معاملہ اچھا ہی ہو گا۔

(۱۱-۱۵) اللہ کی راہ میں انفاق قیامت کے دن ان لوگوں کے لیے روشنی بنے گا جو اخلاص کے ساتھ انفاق کریں گے۔ اس روشنی سے وہ لوگ محروم رہیں گے جو نفاق کے سبب سے انفاق سے جی چراتے رہے۔ اس طرح کے لوگ ایمان والوں سے درخواست کریں گے کہ ذرا ہمیں بھی اپنی روشنی سے فائدہ اٹھانے کا موقع دیجیے لیکن ان کو جواب ملے گا کہ اس روشنی کو حاصل کرنے کا وقت پیچھے تھا جو تم نے کھو دیا۔ اب یہ چیز تمھیں نصیب ہونے والی نہیں ہے۔ اس کے بعد ان کے اور اہلِ ایمان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی جس کے ایک طرف اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو گی اور دوسری جانب اس کا عذاب بھڑک رہا ہو گا۔

(۱۶-۱۷) منافقین کو تہدید کہ اگر غلبۂ حق کی اتنی واضح نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی تمھاری آنکھیں نہ کھلیں تم اسی طرح تردّد و تذبذب میں مبتلا اور خدا کی راہ میں انفاق سے جی چراتے رہے تو یاد رکھو کہ تمھارے دل بھی اسی طرح سخت ہو جائیں گے جس طرح یہود کے دل سخت ہو گئے اور پھر تمھارا انجام بھی وہی ہو گا جو ان کا ہوا۔ یاد رکھو کہ آخرت لازمی ہے، نہ اس کی جزا سے مایوس ہونا جائز ہے نہ اس کی سزا سے بے خوف ہونا۔

(۱۸-۱۹) جو لوگ اللہ کی راہ میں انفاق اور جہاد کرتے ہیں وہ اطمینان رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی قربانیوں کو ضائع کرنے والا نہیں ہے بلکہ ان کی ہر قربانی کا صلہ ان کو مضاعف ہو کر ملے گا۔ یہی انفاق و جہاد زینہ ہے اس مرتبہ تک پہنچنے کا جو صدّیقین و شہدا کے لیے خاص ہے اور اسی کے صلہ میں وہ روشنی ملے گی جس

سے منافقین محروم رکھے جائیں گے۔

(۲۰-۲۱) ان لوگوں کی پست، حوصلگی اور تنگ دامنی پر اظہارِ افسوس جو اس دنیا کی چند روزہ لذّتوں پر فریفتہ ہو کر اپنے رب کی مغفرت اور اس وسیع جنت کو بھول بیٹھے جس کی وسعت، زمین و آسمان کی وسعت کے مانند ہوگی۔

(۲۲-۲۴) اس حقیقت کی یاد دہانی کہ فقر و غنا کا تعلق انسان کی اپنی سعی و تدبیر سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی تقدیر سے ہے۔ انسان کے لیے صحیح رویّہ یہ ہے کہ وہ سختی و نرمی دونوں حالتوں میں اپنے رب سے راضی و مطمئن رہے۔ اگر اس کو اللہ نے مال دے رکھا ہے تو وہ اس کی راہ میں خرچ کرنے سے دریغ نہ کرے۔ اس بات کو ہمیشہ یاد رکھے کہ اللہ کے اختیار میں جس طرح بخشنا ہے اسی طرح چھین لینا بھی ہے۔

(۲۵-۲۷) ان لوگوں کے زعم کی تردید جو مذہب کے رہبانی تصور کے تحت جہاد بالسّیف اور اس راہ میں انفاق کو دنیا داری سمجھتے اور مسلمانوں کے شوقِ جہاد پر طعن کر رہے تھے۔ نبیوں اور رسولوں کی تاریخ کے حوالہ سے بتایا گیا ہے کہ جہاد انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور رہبانیّت نصاریٰ کی ایجاد کردہ بدعت ہے جو انھوں نے اپنے دین میں غلو کی راہ سے پیدا کی ہے، حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیم سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۲۸-۲۹) مسلمانوں کو یہ تلقین کہ تم اللہ کے رسول کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے سرفروشانہ جہاد کے لیے اٹھو اور اس راہ میں پوری فیاضی سے اپنے مال خرچ کرو۔ اہل کتاب میں سے جو مفسدین تمھارے دلوں میں یہ وسوسہ اندازی کر رہے ہیں کہ جہاد ایک دنیا دارانہ کام ہے ان کی وسوسہ اندازیوں کو نظرانداز کرو۔ قیامِ عدل کے لیے جہاد ابتداء سے انبیاء علیہم السلام کی سنت ہے اور تم کو انہی کی سنت کی پیروی کی دعوت دی گئی ہے۔ نصاریٰ نے جو رہبانیّت ایجاد کی ہے اس کو حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ حسد کا بخار ہے جو تمھارے خلاف نکال رہے ہیں لیکن ان کے حسد کے علی الرغم اللہ تعالیٰ تمھیں وہ مقام دے کر رہے گا جو اس نے تمھارے لیے مقدّر کر رکھا ہے۔

سُورَةُ الحَدِيدِ (۵۷)

مَدَنِيَّةٌ —— آیات: ۲۹

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

آیات ۱-۶

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱﴾ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲﴾ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۳﴾ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۚ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۚ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۚ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۴﴾ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۵﴾ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِی النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّيْلِ ۚ وَهُوَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۶﴾

ترجمہ آیات ۱-۶

اللہ ہی کی تسبیح کرتی ہیں ساری چیزیں جو آسمانوں اور زمین میں ہیں اور وہ غالب و حکیم ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے۔ وہی زندہ کرتا اور وہی مارتا ہے اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہی اوّل بھی ہے اور آخر بھی اور ظاہر بھی اور

باطن بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ ۱-۳

وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا چھ دنوں میں پھر وہ عرش پر متمکّن ہوا۔ وہ جانتا ہے اس چیز کو جو زمین میں داخل ہوتی ہے اور جو اس سے نکلتی ہے اور جو آسمان سے اترتی اور جو اس میں چڑھتی ہے اور وہ تمھارے ساتھ ہوتا ہے جہاں کہیں بھی تم ہوتے ہو اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ سب کو دیکھتا ہے۔ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کی ہے اور تمام امور کا مرجع اللہ ہی ہے۔ ۴-۵

وہی داخل کرتا ہے رات کو دن میں اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں اور وہ سینوں کے بھیدوں کو بھی جانتا ہے۔ ۶

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ (۱)

تسبیح کی حقیقت اور اس کے مختلف پہلو

لفظ "تسبیح" کی وضاحت جگہ جگہ ہو چکی ہے۔ اس کے اندر تنزیہہ کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اور بندگی و عبادت کا بھی۔ یہ چیز قول سے بھی ہوتی ہے اور عمل سے بھی۔ زبان سے اللہ تعالیٰ کی پاکی بیان کرنا بھی تسبیح ہے اور نماز پڑھنا اور اس کے حضور میں قیام، رکوع اور سجود بھی تسبیح ہے۔ اس کی شکلیں مختلف ہیں۔ کائنات کی ہر چیز کسی نہ کسی صورت میں اپنے رب کی تسبیح کرتی ہے۔ یہاں تک کہ قرآن میں یہ حقیقت بھی واضح فرمائی گئی ہے کہ جو انسان طوعاً تسبیح نہیں کرتے ہیں انھیں تکوینی دائرے میں کرھاً یہ کام کرنا پڑتا ہے۔ چنانچہ اسی بنیاد پر لوگوں سے یہ مطالبہ کیا گیا ہے کہ وہ اپنے دائرۂ اختیار اور دائرۂ تکوین میں بے ربطی نہ پیدا کریں۔ اس نکتہ کی وضاحت اس کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔

کائنات کی تمام چیزوں کی تسبیح کا حوالہ قرآن میں جہاں جہاں دیا گیا ہے وہ بالعموم تین مقاصد کو سامنے رکھ کر دیا گیا ہے۔

ایک یہ کہ لوگوں کو اس حق کی یاددہانی کی جائے کہ جب اس کائنات کی ہر چھوٹی بڑی چیز اپنے خالق و مالک کا حق پہچانتی اور اس کی تسبیح کرتی ہے تو انسان پر بدرجۂ اولیٰ یہ حق عائد ہوتا ہے

کہ وہ اپنے رب کی تسبیح کرے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اشرف المخلوقات کا درجہ بخشا اور اپنی خلافت کی خلعت سے نوازا ہے۔

دوسرا یہ کہ اس فرض کو ادا کرنے کے لیے اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی کی جائے کہ وہ دنیا میں ناسپاسوں کی کثرت دیکھ کر بد دل اور پست حوصلہ نہ ہوں۔ اگر انسانوں میں اپنے رب کا حق پہچاننے والے تھوڑے ہیں تو یہ چیز دل برداشتہ ہونے کی نہیں ہے۔ باقی ساری کائنات کی ہر چیز اپنے رب کی تسبیح و تقدیس میں سرگرم ہے۔ اس راہ کا مسافر تنہا نہیں ہے بلکہ قافلوں سے بھری ہوئی راہ یہی ہے۔

تیسرا یہ کہ ان لوگوں سے اظہارِ بے نیازی کیا جائے جو یاددہانی کے باوجود اللہ تعالیٰ کی بندگی سے گریز کر رہے ہیں اور ان کو بتایا جائے کہ اگر وہ خدا کی تسبیح نہیں کرتے ہیں تو خدا ان کی تسبیح کا محتاج نہیں ہے۔ اس کائنات کی ہر چیز اس کی تسبیح کر رہی ہے، اگر کچھ بدقسمت انسان اس سے گریز کر رہے ہیں تو وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ رہے ہیں بلکہ اپنا ہی بگاڑ رہے ہیں۔

قرآن میں بعض جگہ یہ تینوں مطالب پیشِ نظر ہیں۔ بعض جگہ ان میں سے ایک یا دو مدِّنظر ہیں۔ ان میں امتیاز کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے اگر سررشتۂ نظم پر نگاہ جمی رہے تو غور کرنے والا آسانی سے امتیاز کر لیتا ہے۔

صفاتِ عزیز و حکیم کے تقاضے

'وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ' یعنی اللہ تعالیٰ چونکہ 'عزیز' اور ساتھ ہی 'حکیم' ہے اس وجہ سے وہی حق دار ہے کہ سب اسی کی تسبیح و بندگی کریں۔ 'عزیز' یعنی ہر چیز پر غالب، ہر اختیار کا مالک، کوئی نہیں جو اس کی دسترس سے باہر ہو، کوئی نہیں جو اس کو دبا سکے یا اپنے زور سے اس پر اثر انداز ہو سکے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ حکیم بھی ہے اس وجہ سے اس کا ہر فعل حکمت، عدل اور رحمت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنے زور میں جو چاہے کر ڈالے خواہ اس میں کوئی حکمت و غایت ہو یا نہ ہو۔ یہ کائنات اس کی قدرت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے اور یہ اپنے وجود سے شہادت دے رہی ہے کہ اس کو وجود میں لانے والا ہر چیز پر غالب ہے اور اس کے ہر کام میں اتھاہ حکمت پوشیدہ ہے۔ اس کی یہ حکمت مقتضی ہے کہ وہ ایک ایسا دن بھی لائے جس میں ان لوگوں کو صلہ عطا فرمائے جنھوں نے اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر زندگی گزاری اور ان لوگوں کو سزا دے جنھوں نے اس کے حدود سے تجاوز کیا۔ اگر وہ ایسا نہ کر سکے تو یہ اس کی عزت و قدرت کے منافی ہے اور اگر کر سکنے کے باوصف نہ کرے تو یہ اس کی حکمت اور اس کے عدل و رحمت کے منافی ہے۔ اس کے بغیر یہ دنیا بازیچۂ اطفال اور ایک اندھیر نگری بن کے رہ جاتی ہے اور ایک عزیز و حکیم کی شان کے یہ بالکل خلاف ہے کہ وہ اتنا بڑا کارخانہ محض کھیل تماشے کے طور پر بنا ڈالے۔

لَهٗ مُلۡكُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ يُحۡىٖ وَيُمِيۡتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ (۲)

مزید صفات کا حوالہ

یعنی آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کے ہاتھ میں ہے، کوئی دوسرا اس کے اقتدار میں ساجھی نہیں ہے کہ کسی قسم کی مداخلت کر سکے۔ 'یُحۡىٖ وَيُمِيۡتُ' وہی زندگی بخشتا اور موت دیتا ہے۔ یعنی جب زندگی اس کی بخشی ہوئی ہے اور موت بھی اسی کے حکم سے واقع ہوتی ہے تو اس کی بادشاہی میں کسی اور کی حصہ داری کی گنجائش کہاں سے نکلی!

'وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ' یعنی کوئی کام اس کی قدرت سے باہر نہیں ہے کہ وہ کسی معاون و مددگار کا محتاج ہو۔ اپنی مملکت کے ایک ایک چپّے پر وہ خود قابض و متصرّف ہے اور جو چاہے براہ راست اپنے کلمۂ کُن سے کر سکتا ہے۔

هُوَ الۡاَوَّلُ وَالۡاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالۡبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ (۳)

احاطۂ قدرت کے بعد یہ اس کے احاطۂ علم کا بیان ہے کہ وہی اوّل ہے اور وہی آخر ہے۔ جب کچھ نہیں تھا وہ تھا اور جب کچھ نہیں ہوگا تب بھی وہ ہوگا۔ اسی نے ہر چیز کا آغاز کیا ہے اور بالآخر ہر چیز کی وراثت اسی کو لوٹنے والی ہے۔

'وَالظَّاهِرُ وَالۡبَاطِنُ' کی تفسیر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں فرمائی ہے: 'انت الظاهر فليس فوقك شیٔ وانت الباطن فليس دونك شیٔ' (تو ظاہر ہے پس کوئی چیز تجھ سے اوپر نہیں اور تو باطن ہے پس کوئی چیز تجھ سے اوجھل نہیں) آیت ۳ میں یہ الفاظ بالکل اسی معنی میں استعمال ہوئے ہیں جس معنی میں ہم اندر رباہر کے الفاظ بولتے ہیں یعنی اللہ تعالیٰ کا علم اندر و باہر ہر چیز کو محیط ہے۔

'وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ' یہ ایک کلیہ کی شکل میں خلاصہ سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ اس کے لیے ظاہر و باطن سب یکساں ہے۔

هُوَ الَّذِىۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ فِىۡ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسۡتَوٰى عَلَى الۡعَرۡشِ ؕ يَعۡلَمُ مَا يَلِجُ فِى الۡاَرۡضِ وَمَا يَخۡرُجُ مِنۡهَا وَمَا يَنۡزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعۡرُجُ فِيۡهَا ؕ وَهُوَ مَعَكُمۡ اَيۡنَ مَا كُنۡتُمۡ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرٌ (۴)

اللہ تعالیٰ کا اقتدار اور اس کی نگرانی

یہ اس احاطۂ علم و قدرت کی مزید تفصیل ہے کہ اللہ ہی نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا ہے اور ان کو پیدا کر کے ان کا انتظام دوسروں کے سر ڈال کر وہ کسی گوشے میں نہیں جا بیٹھا ہے بلکہ وہ بذاتِ خود عرشِ حکومت پر متمکن ہو کر سارے انتظام کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ 'عرش' تعبیر ہے زمامِ اقتدار اور حکومت کی۔ 'فِىۡ سِتَّةِ اَيَّامٍ' کی وضاحت ہم دوسرے مقامات میں کر چکے ہیں کہ اس سے مراد ہمارے ایام نہیں بلکہ خدائی ایام ہیں۔

قرآن میں جہاں کہیں آسمانوں اور زمین کے چھ دنوں میں پیدا کیے جانے کا ذکر آیا ہے اس سے

مقصود اس اہتمام خاص کی طرف ہم کو متوجہ کرنا ہے جو اللہ تعالیٰ نے ان کے پیدا کرنے میں ملحوظ رکھا ہے۔ اور پھر اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو چیز اللہ تعالیٰ نے اس اہتمام سے پیدا کی ہے کس طرح ممکن ہے کہ اس کو پیدا کر کے وہ اس سے بالکل بے تعلق ہو کے بیٹھ رہے؟ نہ اس کے خیر سے اسے کوئی دلچسپی رہے، نہ اس کے شر سے اسے کوئی تعلق، لوگ جو دھاندلی چاہیں اس میں مچاتے پھریں اور وہ خاموش تماشائی کی طرح تماشا دیکھتا رہے! اگر وہ ایسا کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے یہ ساری کائنات محض ایک کھیل کے طور پر بنائی ہے جس میں اہتمام تو اس نے بہت صرف کیا مگر اس کا مقصد کچھ بھی نہیں۔

یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ۔ یہ وضاحت ہے اس بات کی کہ وہ نہایت بیدار مغزی اور جزرسی کے ساتھ اپنی مملکت کی دیکھ بھال کر رہا ہے۔ فرمایا کہ زمین میں جو چیز داخل ہوتی ہے وہ اس کو بھی جانتا ہے اور جو چیز نکلتی ہے اس کو بھی جانتا ہے۔ اسی طرح جو چیز آسمان سے اترتی ہے وہ بھی اس کے علم میں ہوتی ہے اور جو چیز اس میں چڑھتی ہے اس سے بھی وہ باخبر ہوتا ہے۔ نیز تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ ہوتا ہے اور جو کچھ بھی تم کرتے ہو اس کو دیکھ رہا ہوتا ہے۔

لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۵)

یعنی اللہ تعالیٰ صرف ہر چیز سے واقف ہی نہیں ہے بلکہ عملاً تمام امور کا مرجع و ماویٰ بھی وہی ہے۔ سارے امور اسی کے حکم سے جاری ہوتے ہیں اور پھر ان سب کی رپورٹ اسی کے آگے پیش ہوتی ہے۔ اس کے کارندے جملہ ہدایات کے لیے اسی سے رجوع کرتے اور اپنی کارگزاریاں اسی کے حضور میں پیش کرتے ہیں۔ نہ کوئی اپنی صوابدید پر کچھ کرنے کا مجاز ہے اور نہ کوئی اس کے آگے مسئولیت سے بری ہے۔

یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ وَیُوْلِجُ النَّهَارَ فِی الَّیْلِ ؕ وَهُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۶)

یعنی یہ رات اور دن کا چکر جو چل رہا ہے نہ اپنے آپ چل رہا ہے اور نہ کوئی اور اس کو چلا رہا ہے بلکہ یہ اللہ ہی ہے جو اس کو چلا رہا ہے۔ وہی رات کو دن میں اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور نکالتا ہے اور وہ ایک دوسرے کے تعاقب میں برابر سرگرم تگاپو ہیں۔

وَهُوَ عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ یعنی جب دن کی روشنی اور رات کی تاریکی دونوں کا لانے والا وہی ہے۔ وہی دن کی روشنی نمودار کر کے رات کی عالم گیر تاریکی کو کافور اور اس کی ڈھانکی ہوئی ہر چیز کو بے نقاب کرتا ہے تو اس سے کوئی چیز کس طرح مخفی رہ سکتی ہے۔ وہ ہر مخفی سے مخفی راز یہاں تک کہ سینوں کے بھیدوں سے بھی پوری طرح باخبر ہے۔

۲- آگے آیات ۷ - ۱۵ کا مضمون

آگے ان مسلمانوں کو مخاطب فرمایا ہے جو کلمہ پڑھ کر اور سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کا اقرار کر کے مسلمانوں کے زمرے میں شامل تو ہو گئے تھے لیکن جب انفاق و جہاد کا مرحلہ سامنے آیا تو وہ ایمان کے تقاضے پورے کرنے میں بودے ثابت ہوئے۔ اس طرح کے کمزور مسلمانوں کو متنبہ فرمایا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کے آئینہ میں اپنے کردار کا جائزہ لیں اور جس ایمان کا انھوں نے اظہار کیا ہے اس کے مطالبے پورے کریں۔ آج اگر وہ چاہیں تو رسول کی دعوتِ انفاق و جہاد پر لبیک کہہ کے اپنا مقام سابقین اسلام کی صف میں محفوظ کر سکتے ہیں ورنہ یاد رکھیں کہ ان کا حشر منافقین کے ساتھ ہوگا اور جو فرصت آج وہ کھو دیں گے اس کے پا سکنے کا پھر کوئی امکان باقی نہیں رہے گا۔

آیات ۷ - ۱۵

آمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ وَأَنفِقُوا مِمَّا جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ ۖ فَالَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ وَأَنفَقُوا لَهُمْ أَجْرٌ كَبِيرٌ ﴿٧﴾ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۙ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ لِتُؤْمِنُوا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ أَخَذَ مِيثَاقَكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٨﴾ هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ بِكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿٩﴾ وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا ۚ وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ ۚ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿١٠﴾ ع ۱۷ مَّن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ وَلَهُ أَجْرٌ كَرِيمٌ ﴿١١﴾ يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ

نورهم بين ايديهم وبايمانهم بشرىكم اليوم جنّٰت تجري من تحتها الانهٰر خٰلدين فيها ۚ ذٰلك هو الفوز العظيم ﴿۱۲﴾ يوم يقول المنٰفقون والمنٰفقٰت للذين اٰمنوا انظرونا نقتبس من نوركم ۚ قيل ارجعوا وراءكم فالتمسوا نورا ۚ فضرب بينهم بسور له باب ۚ باطنه فيه الرحمة وظاهره من قبله العذاب ﴿۱۳﴾ ينادونهم الم نكن معكم ۚ قالوا بلٰى ولٰكنكم فتنتم انفسكم وتربصتم وارتبتم وغرتكم الاماني حتٰى جاء امر الله وغركم بالله الغرور ﴿۱۴﴾ فاليوم لا يؤخذ منكم فدية ولا من الذين كفروا ۚ مأوٰىكم النار ۚ هي مولٰىكم ۚ وبئس المصير ﴿۱۵﴾

ترجمہ آیات ۷ - ۱۵

ایمان لاؤ اللہ اور اس کے رسول پر اور خرچ کرو اس مال میں سے جس میں اس نے تم کو امین بنایا ہے۔ پس جو لوگ تم میں سے ایمان لائیں اور خرچ کریں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ اور تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ پر ایمان نہیں لا رہے ہو درآنحالیکہ رسول تم کو تمھارے رب پر ایمان لانے کی دعوت دے رہا ہے اور وہ تم سے مضبوط عہد لے چکا ہے، اگر تم مومن ہو! ۷ - ۸

وہی ہے جو اتارتا ہے اپنے بندے پر واضح آیات تاکہ تمھیں نکالے تاریکیوں سے روشنی کی طرف اور بے شک اللہ تمھارے حال پر نہایت ہی شفیق اور مہربان

ہے۔ اور تمھیں کیا ہوا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو حالانکہ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کو لوٹنے والی ہے! تم میں سے جو لوگ فتح مکہ سے پہلے انفاق و جہاد کریں گے اور جو بعد میں انفاق و جہاد کریں گے یکساں نہیں ہوں گے۔ ان لوگوں کا درجہ ان سے بڑا ہوگا جو بعد میں انفاق اور جہاد کریں گے۔ اگرچہ اللہ کا وعدہ ان میں سے ہر ایک سے اچھا ہی ہے۔ اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے اچھی طرح باخبر ہے۔ ۹۔۱۰

کون اٹھتا ہے کہ اللہ کو قرض دے اچھا قرض کہ وہ اس کو اس کے لیے بڑھائے اور اس کے لیے باعزت صلہ ہے! اس دن کو یاد رکھو جس دن ایمان والوں اور ایمان والیوں کو دیکھو گے کہ ان کی روشنی ان کے آگے اور ان کے داہنے چل رہی ہوگی —— تمھارے لیے آج کے دن خوش خبری ہے باغوں کی جن میں نہریں جاری ہوں گی ان میں ہمیشہ رہو گے! یہی دراصل بڑی کامیابی ہے! جس دن منافق مرد اور منافق عورتیں ایمان والوں کو آواز دیں گے کہ ذرا ہمیں بھی موقع عنایت کیجیے کہ ہم آپ کی روشنی سے فائدہ اٹھالیں! ان کو جواب ملے گا کہ تم پیچھے لوٹو اور وہاں روشنی تلاش کرو۔ پس ان کے اور اہلِ ایمان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ اس کے اندر کی جانب میں رحمت ہوگی اور اس کے باہر کی طرف عذاب ہوگا۔ یہ ان سے فریاد کریں گے کہ کیا ہم آپ لوگوں کے ساتھ نہیں تھے؟ وہ جواب دیں گے کہ ساتھ تو تھے لیکن تم نے اپنے کو فتنوں میں مبتلا رکھا، ہمارے لیے گردشوں کے انتظار میں رہے، شبہات میں مبتلا رہے اور آرزوؤں نے تمھیں دھوکے

میں رکھا یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہو گیا اور فریب دینے والے نے تمھیں اللہ کے باب میں مبتلائے فریب ہی رکھا۔ پس آج نہ تو تم سے کوئی فدیہ قبول ہو گا اور نہ ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا۔ تم سب کا ٹھکانا آگ ہے۔ وہی تمھارا مرجع ہے اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے!! ۱۱-۱۵

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اٰمِنُوۡا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَکُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِیۡنَ فِیۡہِ ؕ فَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ وَاَنۡفَقُوۡا لَہُمۡ اَجۡرٌ کَبِیۡرٌ (۷)

عام خطاب سے منافقین کو تنبیہ

'اٰمِنُوۡا' کا خطاب اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن آگے قرائن سے واضح ہو جائے گا کہ روئے سخن درحقیقت خام قسم کے مسلمانوں اور منافقین کی طرف ہے جو اللہ اور رسول پر ایمان کا دعویٰ تو کر بیٹھے لیکن جب اس ایمان کے مطالبے، انفاق اور جہاد کی صورت میں، سامنے آئے تو ان سے کترانے اور منہ چھپانے لگے۔ اس طرح کے مدعیانِ ایمان سے خطاب کر کے فرمایا کہ اللہ اور رسول پر ایمان لاؤ۔ ظاہر ہے کہ یہاں فعل 'اٰمِنُوۡا' اپنے حقیقی اور کامل معنی میں ہے جس طرح 'یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اٰمِنُوۡا' (اے وہ لوگو جو ایمان کے مدعی ہو سچا اور پکا ایمان لاؤ) میں ہے۔ فعل کے اپنے ابتدائی معنی اور اپنے کامل معنی میں استعمال کی مثالیں پیچھے گزر چکی ہیں۔

ایمان کا لازمی تقاضا

'وَاَنۡفِقُوۡا مِمَّا جَعَلَکُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِیۡنَ فِیۡہِ' یہ اس ایمان کا لازمی تقاضا بھی بیان ہوا ہے اور اس کی نہایت واضح عقلی اور فطری دلیل بھی۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسول پر ایمان کا حق صرف 'اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَرَسُوۡلِہٖ' کے اقرار و اظہار سے نہیں ادا ہو جاتا بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ جب اللہ کی راہ میں مال و جان کی قربانی کی دعوت دی جائے تو اس پر لبیک کہو۔ جو لوگ مال بھی خرچ کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتے ان سے جان کی قربانی کی توقع کس طرح کی جا سکتی ہے! اور جو نہ مال قربان کرنے کا حوصلہ رکھتے ہوں نہ جان، ان کے دعوائے ایمان کی کیا وقعت ہے۔

مال اللہ تعالیٰ کی امانت ہے

'مِمَّا جَعَلَکُمۡ مُّسۡتَخۡلَفِیۡنَ فِیۡہِ' یعنی اس مال کے متعلق تمھیں یہ حقیقت پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ تم نہ تو اس کے خالق ہو نہ مالک بلکہ اللہ تعالیٰ ہی نے تمھیں اس میں خلیفہ بنایا ہے کہ تم اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کے اندر اس میں تصرف کرو اور اس کے حضور میں اس کی پائی پائی کی جواب دہی

کے لیے تیار رہو۔ مطلب یہ ہوا کہ جب تم اس مال کے خالق و مالک نہیں بلکہ صرف اس کے امین ہو تو جب اس مال کے خرچ کرنے کا مطالبہ اسی کی طرف سے ہو رہا ہے جس نے تم کو اس کا امین بنایا ہے تو اس سے بخالت کرنے کے کیا معنی؟

انفاق ایمان کی تصدیق ہے

فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِیْرٌ۔ یہاں 'اٰمَنُوْا' کے بعد 'اَنْفَقُوْا' ایمان کی تصدیق اور شہادت کے طور پر آیا ہے۔ یعنی جو لوگ ایمان کا اظہار کرنے کے بعد اپنے 'انفاق' سے اپنے اس اقرار کی تصدیق کر دیں گے وہ مطمئن رہیں کہ ان کا یہ سودا خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ اللہ کے ہاں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ وہ ایک کا دس پائیں گے تو ایسے نفع بخش کاروبار میں سرمایہ لگانے سے وہ کیوں گھبرائیں۔

یہاں وہ بات یاد رہے جس کی طرف اوپر ہم نے اشارہ کیا ہے کہ سورہ کی تمہید میں جو صفاتِ الٰہی بیان ہوئی ہیں وہ بمنزلہ ایک آئینہ کے ہیں تاکہ اس کو سامنے رکھ کر وہ لوگ اپنے اخلاق و کردار کو سنواریں جنھوں نے ایمان کا دعویٰ کیا ہے۔ اوپر ارشاد ہوا ہے کہ اللہ ہی اوّل و آخر ہے اور ساری چیزیں اسی کی طرف لوٹنے والی ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اصل حقیقت یہ ہے تو اس دنیا میں انسان کو جو کچھ بھی حاصل ہوا ہے وہ اس کا مالک نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا امین ہے تو جب اصل مالک اللہ ہے تو اس کا مال اسی سے دریغ رکھنے کے کیا معنی!

وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِیْثَاقَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۸)

یہ اس طرح کے کمزور مسلمانوں کے لیے نصیحت باندازِ ملامت ہے کہ جب تم رسول سے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کا عہد کر چکے ہو تو اس عہد کا تقاضا تو یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم اترے اور رسول جس بات کی دعوت دیں اس پر 'اٰمَنَّا وَصَدَّقْنَا' کہتے ہوئے عمل کرو لیکن تمھارا حال یہ ہے کہ رسول، اللہ کی راہ میں انفاق کی دعوت دے رہا ہے اور تم منہ چھپاتے پھر رہے ہو! تو یہ کس قسم کا عہد اور کس نوع کا ایمان ہے! اور جب آج تمھارے ایمان اور عہد کا یہ حال ہے جب کہ رسول تمھارے اندر موجود ہے اور بذاتِ خود تمھیں ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی دعوت دے رہا ہے تو کل تمھارا کیا حال ہو گا جب رسول تمھارے درمیان موجود نہیں ہو گا۔

اس آیت سے دو باتیں نہایت واضح طور پر سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ ایمان کا لازمی تقاضا ہے کہ آدمی ہر اس چیز پر ایمان لائے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی اور رسول نے جس کی دعوت دی۔ ان میں سے کسی ایک چیز کا انکار بھی سب کے انکار کے ہم معنی ہے۔

دوسری یہ کہ ایمان عمل ہی سے متشکل اور وجود پذیر ہوتا ہے اور انفاق کو اس کے نشو و نما اور اس کے تغذیہ و تقویت میں خاص دخل ہے چنانچہ اسی بنا پر یہاں انفاق کی دعوت کو ایمان کی دعوت سے تعبیر فرمایا ہے۔

میثاق سے سمع و طاعت کا عہد مراد ہے

'میثاق' سے مراد میرے نزدیک یہاں سمع و طاعت کا وہ عہد ہے جو ہر مسلمان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کے وقت کرنا پڑتا۔ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کا رجحان اس عہد کی طرف معلوم ہوتا ہے جس کا ذکر سورۂ آل عمران کی آیت ۸۱ میں ہے۔ میں نے اس پر غور کیا لیکن یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ دوسرے سیاق و سباق کی بات ہے، یہاں اس کا محل نہیں ہے۔ میرے خیال کی تائید سورۂ مائدہ کی آیت ۷ سے بھی ہوتی ہے: وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُم بِهِ إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا (پس اپنے اوپر اللہ کے فضل اور میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا اور تم نے 'سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا' کہہ کر اس کا اقرار کیا)۔

هُوَ الَّذِي يُنَزِّلُ عَلَىٰ عَبْدِهِ آيَاتٍ بَيِّنَاتٍ لِّيُخْرِجَكُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ إِلَى النُّورِ ۚ وَإِنَّ اللَّهَ بِكُمْ لَرَءُوفٌ رَّحِيمٌ (۹)

انفاق تاریکی سے روشنی میں لاتا ہے۔

یعنی رسول تمہیں انفاق کی جو دعوت دے رہے ہیں اس کو گراں اور اپنے لیے نقصان رساں سمجھ کر اس سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ اللہ تعالیٰ اپنے رسول پر یہ روشن آیتیں اس لیے نازل فرما رہا ہے کہ تمہیں خواہشاتِ نفس اور حُبِّ دنیا کی تاریکیوں سے نکال کر ایمان اور حُبِّ آخرت کی روشنی میں لائے۔ یہ نہ گمان کرو کہ اللہ تعالیٰ تمہیں نقصانات اور مشقتوں میں ڈالنا چاہتا ہے۔ وہ رؤف و رحیم ہے۔ وہ تمہاری دنیا اور آخرت دونوں کی بہبود کی راہ کھول رہا ہے نہ کہ تمہیں کسی زحمت و مشقت میں ڈال رہا ہے۔

'اٰیٰتٍ بَیِّنٰتٍ' سے مراد یوں تو وہ ساری ہی تعلیمات ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے لوگوں کو مل رہی تھیں لیکن یہاں خاص طور پر ان آیات کی طرف اشارہ ہے جو انفاق و جہاد سے متعلق ہیں اور جن کا ایک حصہ آگے اس سورہ میں بھی نہایت روشن دلائل کے ساتھ آ رہا ہے۔

'ظُلُمٰت' سے مراد شہواتِ نفس اور حُبِّ دنیا کی تاریکیاں ہیں جن کا واحد علاج اللہ کی راہ میں انفاق ہے اور 'نُور' سے وہ نور مراد ہے جو انفاق سے پیدا ہوتا ہے اور جس کا ذکر آگے آیت ۱۲ میں آ رہا ہے۔

'رَءُوْفٌ' اور 'رَحِیْمٌ' کی وضاحت ان کے محل میں ہم کر چکے ہیں۔ پہلے میں دفعِ شر کا پہلو غالب ہے، دوسرے میں اثباتِ خیر کا۔

وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ

وَقَـٰتَلُوا۟ ۚ وَكُلًّا وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلْحُسْنَىٰ ۚ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ (۱۰)

ترغیبِ انفاق کی دو دلیلیں

یہ انہی کمزور قسم کے مسلمانوں کو انفاق پر ابھارا ہے اور اس مقصد کے لیے دو دلیلیں انفاق کے محرک کے طور پر بیان فرمائی ہیں۔ ایک وہی جس کی طرف اوپر آیت ۷ کے تحت اشارہ گزر چکا ہے کہ آسمان و زمین کی تمام چیزوں کا مالک اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس دنیا میں انسان کو جن چیزوں پر بھی تصرف حاصل ہوتا ہے وہ بالکل عارضی طور پر، اللہ تعالیٰ کے خلیفہ اور امین کی حیثیت سے، حاصل ہوتا ہے۔ بالآخر ہر چیز اللہ ہی کی طرف لوٹ جانے والی ہے تو جب انسان کی حیثیت چند روزہ امین کی ہوئی تو امانت کے مال پر مارِ گنج بن کر بیٹھ جانے کے کیا معنی! پھر تو اس کے لیے صحیح رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ بخل کرے تو کرے لیکن جس نے اس کی تحویل میں اپنی امانت رکھی ہے اس کو، جب وہ طلب کرے، پوری فیاضی کے ساتھ دے۔

دوسرا یہ کہ حالات کے تغیر سے اعمال کی قدر و قیمت میں بڑا فرق ہو جاتا ہے۔ آج جب کہ کفر اور اہلِ کفر کا مکہ پر غلبہ ہے (واضح رہے کہ یہ سورہ فتح مکہ سے پہلے نازل ہوئی ہے) اور قریش کی ہیبت بدستور عرب پر قائم ہے جو لوگ اسلام کو غالب کرنے کے لیے اپنے مال خرچ کریں گے اور جنگ میں حصہ لیں گے ان لوگوں کا درجہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ان سے کہیں زیادہ بلند ہو گا جو فتح مکہ کے بعد، جب کہ قریش کا زور ٹوٹ جائے گا، انفاق اور جہاد کریں گے۔ بڑے ہی خوش قسمت ہیں وہ لوگ جو آج کے کٹھن حالات میں اسلام کی خدمت کی توفیق پائیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمھیں یہ موقع حاصل ہوا ہے تو اس کو اپنی پست حوصلگی سے ضائع نہ کرو بلکہ ہمت کر کے اسلام کے سابقین اوّلین اور اللہ تعالیٰ کے مقرّبین میں اپنی اپنی جگہ محفوظ کرنے کی کوشش کرو۔

سورہ واقعہ میں یہ حقیقت واضح کی جا چکی ہے کہ سابقین و مقرّبین کے زمرے میں زیادہ تعداد انہی لوگوں کی ہو گی جنھوں نے اسلام کی غربتِ اولیٰ کے دور میں اولوالعزمی کے ساتھ اس کی خدمت کی توفیق پائی۔ بعد کے ادوار کے لوگوں میں سے تھوڑے ہی لوگوں کو ان کے زمرے میں جگہ ملے گی اور یہ وہ لوگ ہوں گے جن کو بڑے سخت امتحانوں سے گزرنا پڑا ہو اور انھوں نے دین کی راہ میں کوئی بہت بڑی بازی کھیلی ہو۔

وَكُلًّا وَعَدَ ٱللَّهُ ٱلْحُسْنَىٰ ۚ وَٱللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ' یعنی وعدہ تو اللہ کا دونوں ہی سے اچھا ہے۔ فتح مکہ کے بعد بھی اسلام کے لیے قربانیاں کرنے والوں کے لیے ان کی خدمات کے اعتبار سے درجے اور مرتبے ہیں۔ حسنِ نیّت اور اخلاص کے ساتھ جو لوگ بھی اسلام کی خدمت کریں گے وہ اپنی قربانیوں کا صلہ پائیں گے بلکہ ان میں سے ایسے لوگ بھی نکلیں گے جو اگلوں کی صف میں جگہ حاصل کریں گے تاہم فتح مکہ سے پہلے کا دور اور ہے۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو اس دور کی قدر پہچانیں اور اس سے صحیح فائدہ اٹھا لیں۔

فتح سے فتح مکہ مراد ہے

یہاں 'فتح' سے مراد ظاہر ہے کہ فتح مکہ ہی ہے۔ بعض لوگوں نے اس سے صلح حدیبیہ بھی مراد لی ہے لیکن صلح حدیبیہ کی حیثیت اصل فتح کی نہیں بلکہ فتح مکہ کی تمہید کی ہے۔ لفظ 'فتح' سے ذہن فتح مکہ ہی کی طرف جاتا ہے۔ اس جدوجہد کے دوران میں ہر مسلمان کے دل میں یہ بات بطور ایک عقیدہ کے راسخ تھی کہ بعثت محمدی (صلی اللہ علیہ وسلم) کا اصل مقصود بیت اللہ کو، کفر و شرک کی تمام آلودگیوں سے پاک کر کے، اس کے اصل ابراہیمی جمال میں خلق کے سامنے نمایاں کرنا ہے۔ چنانچہ ہر سچے مسلمان کو اس واقعہ کے ظہور کا ارمان بھی تھا اور انتظار بھی۔ صرف منافقین اپنے تھڑدلے پن کے سبب سے مذبذب تھے۔ ان کے اس تذبذب کا ذکر آگے ان کے نفاق کی دلیل کی حیثیت سے آ رہا ہے۔

جہاد کے لیے مالی اعانت کی نہایت مؤثر اپیل

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰہَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَہٗ لَہٗ وَلَہٗٓ اَجْرٌ کَرِیْمٌ (۱۱)

اب یہ نہایت واضح اور مؤثر الفاظ میں جہاد کے لیے مالی اعانت کی اپیل ہے کہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دینے کے لیے اٹھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو بڑھائے اور اس کو باعزت اجر عطا فرمائے۔ لفظ 'قرض' سے اگرچہ عام انفاق بھی مراد ہو سکتا ہے لیکن یہاں سیاق و سباق سے واضح ہے کہ اس سے جہاد کے لیے مالی اعانت ہی مراد ہے۔ آگے ہم اس کے بعض قرائن کی طرف ان شاء اللہ اشارہ کریں گے۔

انفاق فی سبیل اللہ کے لیے قرض کے لفظ میں جو اپیل ہے وہ محتاج وضاحت نہیں ہے۔ اوپر واضح ہو چکا ہے کہ انسان کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اللہ تعالیٰ ہی کی سپرد کردہ امانت ہے۔ اب یہ کتنا بڑا فضل ہے اس رب کریم کا کہ وہ اپنا ہی عطا کیا ہوا مال اپنی راہ میں خرچ کرنے کی جب بندوں کو دعوت دیتا ہے تو اس کو اپنے ذمہ قرض ٹھہراتا ہے جس کی واپسی کا وہ گویا اسی طرح ذمہ دار ہے جس طرح ایک قرض دار اپنے مہاجن کی رقم کی واپسی کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

'فَیُضٰعِفَہٗ'، یعنی اللہ تعالیٰ یہ قرض اس لیے نہیں مانگ رہا ہے کہ اس کے خزانے میں کوئی کمی ہے۔ جب سب کچھ اسی کا پیدا کردہ اور اسی کا عطا کردہ ہے تو اس کے پاس کمی کا کیا سوال! بلکہ وہ تو صرف اس لیے مانگ رہا ہے کہ لوگوں کے عطا کردہ مال کو وہ اپنے بنک میں جمع کر کے اس کو اچھی طرح بڑھائے تاکہ اس کا منافع ایک ابدی زندگی میں ایک کبھی نہ ختم ہونے والے سرمایہ کی صورت میں ان کے کام آئے۔ اس اسلوب بیان میں سود خواروں پر جو تعریض ہے وہ اہل ذوق سے مخفی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو اپنا سرمایہ اس دنیا کے بنک میں جمع کرتا ہے تو یہ دنیا اور اس کا سرمایہ، ہر چیز چند روزہ ہے البتہ جو اپنا مال اپنے رب کے پاس جمع کرتے ہیں ان کا منافع ابدی اور ہر اندیشہ سے محفوظ ہے۔

'مُضٰعَفَۃ' کا ترجمہ عام طور پر لوگوں نے دگنا کرنا کیا ہے، لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اس کے معنی

بڑھانے کے ہیں۔ یہ بڑھانا دگنا، چوگنا، دس گنا بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہو سکتا ہے۔ اس کا تعلق دینے والے کے خلوص اور ان حالات سے ہے جن میں وہ مال دیا گیا ہے اور سب سے زیادہ اس ربِ کریم کے فضل سے ہے جس نے اپنے بندوں کے لیے ابدی منفعت کی یہ راہ کھولی ہے۔

قرضِ حسن کے شرائط

اس کے ساتھ یہاں صرف ایک شرط لگائی ہے کہ یہ قرض 'قرضِ حسن' ہو۔ قرآن میں اس کی وضاحت میں جو باتیں فرمائی گئی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قرض، 'قرضِ حسن' اس شکل میں بنتا ہے جب دل کی پوری فراخی اور بلند حوصلگی کے ساتھ دیا جاتا ہے، دل کی تنگی کے ساتھ محض مارے باندھے یا دکھاوے کے لیے نہیں دیا جاتا، اچھے مال میں سے دیا جاتا ہے، محض چھیڑا اتارنے کی کوشش نہیں کی جاتی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ محض اللہ کی خوشنودی کے لیے دیا جاتا ہے، کسی غرضِ دنیوی کے لیے نہ دیا جاتا ہے اور نہ دینے کے بعد اس کے دیے جانے پر احسان جتایا جاتا یا کسی پہلو سے کوئی دل آزاری کی جاتی ہے۔

'وَلَہٗۤ اَجۡرٌ کَرِیۡمٌ'۔ یعنی اس کے دیے ہوئے مال میں جو بڑھوتری ہوگی وہ تو ہوگی ہی، علاوہ ازیں اللہ تعالیٰ خاص اپنے فضل سے بھی اس کو نہایت باعزت اجر دے گا۔ اس کی وضاحت آگے آرہی ہے۔

یَوۡمَ تَرَی الۡمُؤۡمِنِیۡنَ وَالۡمُؤۡمِنٰتِ یَسۡعٰی نُوۡرُہُمۡ بَیۡنَ اَیۡدِیۡہِمۡ وَبِاَیۡمَانِہِمۡ بُشۡرٰىکُمُ الۡیَوۡمَ جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِہَا الۡاَنۡہٰرُ خٰلِدِیۡنَ فِیۡہَا ؕ ذٰلِکَ ہُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ (۱۲)

انفاق قیامت کے دن روشنی بنے گا

یہ اسی باعزت صلہ کے ایک خاص پہلو کی وضاحت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں خرچ کرنے والوں کی رہنمائی جنت کی طرف روزِ حشر اس طرح کرے گا کہ ان کی روشنی ان کے آگے اور دہنے چل رہی ہوگی اور وہ اس روشنی میں جنت کی طرف بڑھیں گے جب کہ دوسرے لوگ جنھوں نے یہ روشنی اپنے اندر نہیں پیدا کی ہوگی تاریکی میں گھرے ہوئے ہوں گے۔

آیات کے سیاق و سباق پر نظر ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ یہ روشنی اسی انفاق کے فیض سے حاصل ہوگی جس کی یہاں دعوت دی جا رہی ہے۔ اوپر آیت ۹ 'ہُوَ الَّذِیۡ یُنَزِّلُ عَلٰی عَبۡدِہٖۤ اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ لِّیُخۡرِجَکُمۡ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوۡرِ' کے تحت ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ 'اٰیٰتٍۭ بَیِّنٰتٍ' سے اشارہ یہاں خاص طور پر ان آیات کی طرف ہے جو انفاق کی عظمت و اہمیت واضح کرنے کے لیے نازل ہوئیں۔ اسی انفاق سے نفاق کی جڑ کٹتی ہے اور اسی سے وہ نورِ حکمت عطا ہوتا ہے جو اس دنیا کی تاریکیوں میں بھی انسان کی رہنمائی کرتا ہے اور آخرت میں بھی یہ رہنمائی کرے گا۔

'سعی' یہاں دوڑنے کے مفہوم ہی میں نہیں ہے۔ یہ لفظ کسی کام کے سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ ہونے یا اس کو مستعدی کے ساتھ کرنے کے معنی میں بھی آتا ہے بلکہ اس کا غالب استعمال اسی معنی میں ہے۔ یہاں

یہ اسی مفہوم میں ہے۔ یہ نور صرف ان کے آگے اور ان کے داہنے پھیلے گا، بائیں جانب اس کا عکس نہیں پڑے گا تاکہ اصحاب الشمال اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ آگے ان کی اس نور سے محرومی کا ذکر آ رہا ہے۔

'بُشْرٰىكُمُ الْيَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ' یہ بشارت صورتِ حال کی تعبیر بھی ہو سکتی ہے اور فرشتوں کی زبانی بھی ہو سکتی ہے۔ قرآن میں نظائر دونوں کی تائید میں موجود ہیں۔

'ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ' یعنی اگر کسی کو اللہ نے مال بخشا ہے تو اس سے وہ سب سے بڑا فائدہ جو حاصل کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کر کے اپنے دل کے اندر وہ روشنی پیدا کرے جو قیامت کے اندھیرے میں اس کی رہنمائی کرے۔ اس کے سوا جتنے فائدے بھی ہیں وہ وقتی اور عارضی ہیں اور ان کے اندر جو مزر مضمر ہے وہ دائمی اور ابدی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حوصلہ ہے تو اس 'فوزِ عظیم' کو حاصل کرنے کے لیے اپنے مال خرچ کرو۔

يَوْمَ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِيْلَ ارْجِعُوْا وَرَاۗءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ۭ فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ۭ بَاطِنُهٗ فِيْهِ الرَّحْمَةُ وَظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ (۱۳)

منافقین کی نور سے محرومی

اس دن منافقین کا حال یہ ہو گا کہ وہ اندھیرے میں بھٹک رہے ہوں گے۔ انھوں نے اللہ کی راہ میں انفاق کر کے وہ روشنی اپنے اندر پیدا کرنے کی کوشش نہیں کی جو آخرت میں ان کے کام آتی۔ وہ جب دیکھیں گے کہ ایک گروہ ان لوگوں کا، جن کے اندر وہ دنیا میں رہے بسے، اپنے ساتھ ایسی روشنی رکھتا ہے جو اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں ان کی رہنمائی کر رہی ہے تو وہ نہایت حسرت کے ساتھ ان سے درخواست کریں گے کہ ذرا ہمیں بھی قریب پہنچ لینے دیجیے کہ ہم بھی آپ کی روشنی سے فائدہ اٹھا سکیں۔ ان کو جواب ملے گا کہ اس روشنی سے فائدہ اٹھانے کی تمنا نہ کرو۔ پیچھے پلٹو اور وہاں روشنی تلاش کرنے کی کوشش کرو اگر کر سکتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس روشنی کے حاصل کرنے کی جگہ تو تم پیچھے چھوڑ آئے اب اس کو پانے کا وقت گزر چکا۔ تمھارے لیے اب حسرت، ندامت اور اس تاریکی کے سوا یہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ بعض لوگوں نے اس قول کو العیاذ باللہ محض ایک چکمہ سمجھا ہے لیکن یہ چکمہ نہیں بلکہ بیانِ حقیقت ہے۔ کسب و اکتساب کی جگہ یہ دنیا ہے۔ جس نے اس میں نیکی کی کمائی نہیں کی آخرت میں اس کا حصہ صرف محرومی ہے۔

اس جواب کے بعد فوراً ان کے اور اہلِ ایمان کے درمیان ایک دیوار حائل کر دی جائے گی جس میں صرف ایک دروازہ ہو گا۔ اس کے اندر کے حصہ میں رحمت ہو گی اور اس کے باہر کی جانب

عذاب ہوگا۔ اہلِ ایمان اس دروازے سے رحمت والے حصہ میں چلے جائیں گے اور منافقین عذاب کی تاریکی میں گھر جائیں گے۔ اس قسم کی ایک دیوار کا ذکر سورۂ اعراف میں گزر چکا ہے۔ تفصیل مطلوب ہو تو وہاں دیکھیے۔

يُنَادُونَهُمْ اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ۗ قَالُوْا بَلٰى وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَتَرَبَّصْتُمْ وَارْتَبْتُمْ وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ (۱۴)

منافقین کی فریاد اور ان کو جواب

منافقین جب دیکھیں گے کہ روشنی کی جو جھلک نظر آئی تھی وہ بھی اوجھل ہوگئی اور جن کے ساتھ دنیا میں رہے ان سے بالکل ہی رابطہ ٹوٹ گیا تو وہ دل شکستہ ہو کر فریاد کریں گے کہ بھائیو، آپ لوگوں نے ہمیں بالکل ہی کاٹ پھینکا، کیا دنیا میں ہم آپ لوگوں کے ساتھ نہیں رہے بسے! اپنے بھائیوں سے یہ بے اعتنائی و بے پروائی!!

جواب ملے گا کہ اس میں تو شبہ نہیں کہ دنیا میں تم لوگ بظاہر ہمارے ہی ساتھ رہے لیکن تمہارے دل ہمارے ساتھ نہیں تھے بلکہ تم انہی فتنوں میں مبتلا رہے جن سے اللہ نے تم کو نکالنا چاہا۔ تم نے ایمان کا دعویٰ بڑی بلند آہنگی سے کیا لیکن اس ایمان کے جتنے مطالبے تمہارے سامنے آئے ان میں سے ایک کو بھی پورا کرنے کا حوصلہ تم نے نہیں کیا۔ اپنے مال اور اپنی جان کو اللہ کے دین اور اس کے رسول سے تم نے زیادہ عزیز جانا، تمہاری وفاداریاں اسلام کے دشمنوں کے ساتھ رہیں اور حق کی جگہ ہمیشہ اپنے مفادِ ذاتی کو تم نے ترجیح دی۔

'وَتَرَبَّصْتُمْ' یعنی تم برابر ہمارے لیے گردشوں اور آفتوں کے منتظر رہے۔ سورۂ توبہ میں ان منافقین کا کردار ان الفاظ میں بیان ہوا ہے: 'وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ' (التوبۃ۔ ۹: ۹۸) (اور ان بدوی منافقین میں وہ بھی ہیں جو اگر کبھی اسلام کی راہ میں کچھ خرچ کر بیٹھتے ہیں تو اس کو اپنے اوپر ایک تاوان خیال کرتے ہیں اور تمہارے لیے برابر گردشوں کے انتظار میں رہتے ہیں) انہی لوگوں کا کردار سورۂ نساء میں یوں بیان ہوا ہے: 'اَلَّذِيْنَ يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ' (النسآء۔ ۴: ۱۴۱) (جن کا حال یہ ہے کہ وہ تمہارے لیے منتظر تو رہتے ہیں شکست کے لیکن ان کے علی الرغم اگر اللہ تمہیں فتح دے دیتا ہے تو غنیمت کی طمع میں بھاگے ہوئے تمہارے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ کیا ہم آپ لوگوں کے ساتھ نہیں رہے ہیں؟)

'وَارْتَبْتُمْ' یعنی تم برابر شک اور تذبذب میں مبتلا رہے۔ اسلام اور پیغمبر کی حقانیت پر کبھی تمہارا دل نہیں جما۔ تم نے کفر اور اسلام دونوں سے تھوڑا تھوڑا تعلق جوڑے رکھنا چاہا کہ اس کشمکش میں جس کو غلبہ حاصل ہوا اپنا مستقبل اس کے ساتھ وابستہ کر لو گے۔ اس ذہنی کیفیت کی تصویر

دوسرے مقام میں اس طرح کھینچی گئی ہے: مُّذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ ذٰلِكَ لَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰى هٰٓؤُلَآءِ (النساء-۴: ۱۴۳) (ان دونوں کے درمیان مذبذب، نہ یکسوئی کے ساتھ اِدھر، نہ یکسوئی کے ساتھ اُدھر)۔

وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ۔ یعنی تم جھوٹی آرزوؤں میں برابر پھنسے رہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمھیں جو ڈھیل ملی تو تم اس دھوکے میں مبتلا ہو گئے کہ تمھاری یہ دورُخی پالیسی کامیاب ہے اور اس کو تم آخر تک کامیابی کے ساتھ نباہ لے جاؤ گے لیکن یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔ شیطان نے تمھیں دھوکے ہی میں رکھا اور اللہ تعالیٰ کا فیصلہ حق کو غالب کرنے کے لیے صادر ہو گیا اور تمھیں یہ روزِ بد دیکھنا پڑا۔

وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ میں لفظ 'غرور' شیطان کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے باب میں دھوکے میں رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ تمھیں یہ آگاہی جو دی جاتی رہی کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا رسول اتمامِ حجت کے لیے بھیج دیا ہے، جو لوگ اس کے بعد بھی اپنے کفر پر اڑے رہیں گے یا نفاق کے پردے میں چھپنے کی کوشش کریں گے وہ لازماً خدا کی گرفت میں آ جائیں گے تو شیطان تم کو یہ سبق پڑھا دیتا تھا کہ یہ سب محض دھونس جمانے کی باتیں ہیں، جو نہ پہلے سچی ثابت ہوئی ہیں نہ آئندہ ہوں گی، ان سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَّلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ۖ هِيَ مَوْلٰىكُمْ ۖ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۱۵)

یعنی یہ صورتِ حال جو تمھیں پیش آئی ہے پوری آگاہی اور اتمامِ حجت کے بعد پیش آئی ہے اس وجہ سے اب اس سے چھوٹنے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔ یہاں کسی کے پاس نہ تو کوئی چیز فدیہ میں دینے کی ہے اور نہ کسی سے فدیہ قبول ہی ہو گا۔ نہ تم سے اور نہ ان کافروں سے جن کے ساتھ تمھارا یارانہ رہا ہے۔ تم چونکہ اسلام کی طرف یکسو نہیں ہوئے اس وجہ سے ایمان کے ادّعا کے باوجود تمھارا اور ان کفّار کا حشر ایک ہی ساتھ ہو گا۔ تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہی تمھارا 'مولیٰ' یعنی مرجع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمھارے لیے نہ خدا کے سامنے کسی داد و فریاد کی گنجائش ہے اور نہ وہاں اب تمھاری کوئی شنوائی ہونی ہے۔ تمھارا مرجع اب دوزخ ہے۔ اب جو کچھ پاؤ گے اسی سے پاؤ گے اور یاد رکھو کہ وہ برا ٹھکانا ہے۔

۴۔ آگے آیات ۱۶-۲۴ کا مضمون

آگے کی آیات میں خطاب کا رخ ان منافقین ہی کی طرف ہے جن سے اوپر کے پیرے میں

خطاب ہے۔ ان کو پہلے تو اس تذبذب کی روش کے انجام بد سے ڈرایا ہے کہ رسولؐ کی تائید میں اتنی واضح نشانیاں دیکھنے کے بعد بھی اگر تمہارا تذبذب دور نہیں ہوا تو بالآخر تمہارے دلوں پر بھی اسی طرح کی قساوت چھا جائے گی جس طرح کی قساوت یہود پر چھا گئی تھی جس کے سبب سے اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی۔

اس کے بعد ان کو کچھ ابھارا ہے کہ موجودہ حالات سے ہراساں نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی قدرت و رحمت پر بھروسہ رکھو۔ جس اللہ کی یہ شان دیکھتے ہو کہ وہ اس سرزمین کو مردہ ہو جانے کے بعد دوبارہ زندہ کر دیتا ہے اس سے بعید نہیں ہے کہ وہ اس دعوتِ حق کو اتنا فروغ دے کہ یہاں کفر کا کوئی نشان باقی نہ رہ جائے۔ اسی ذیل میں ان کو یہ اطمینان بھی دلایا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے خسارے میں رہنے والے نہیں ہیں بلکہ ایک کا ستر پائیں گے اور یہی راستہ ہے اس امت کے صدیقین اور شہداء میں داخل ہونے کا۔

پھر اس دنیا کی ان چیزوں کی بے ثباتی و بے حقیقتی کی تصویر کھینچی ہے جن کے عشق میں پھنس کر لوگ آسمانوں اور زمین کے برابر کی اس ابدی بادشاہی کو بھول بیٹھے ہیں جس کو وہ چاہیں تو اپنے جمع کردہ خزف ریزوں کے عوض خرید سکتے ہیں۔

آخر میں اس نکتہ کی طرف رہنمائی فرمائی ہے کہ اس دنیا میں یُسر اور عُسر، دُکھ اور سُکھ، فقر اور غنا انسان کی اپنی تدبیروں پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا انحصار اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی تقدیر پر ہے۔ اس وجہ سے نہ تو انسان کے لیے یہ جائز ہے کہ فراخی حاصل ہو تو اس کو اپنی تدبیر کا کرشمہ سمجھ کر اس پر اترانے اور اکڑنے لگ جائے اور نہ یہ جائز ہے کہ کوئی ابتلاء پیش آجائے تو مایوس و دل شکستہ ہو کر واویلا شروع کر دے بلکہ وہ نعمت میں شکر اور مصیبت میں صبر کی روش اختیار کرے اور دونوں صورتوں میں اپنے رب پر اپنے دل کو جمائے رکھے۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت کیجیے۔

آیات ۱۶-۲۴

اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا یَكُوْنُوْا كَالَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَیْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۱۶﴾ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَیَّنَّا لَكُمُ الْاٰیٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ الْمُصَّدِّقِیْنَ وَ

الْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ
اَجْرٌ كَرِيْمٌ ﴿۱۸﴾ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ
هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖۗ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ لَهُمْ اَجْرُهُمْ
وَنُوْرُهُمْ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَاۤ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
الْجَحِيْمِ ﴿۱۹﴾ اِعْلَمُوْۤا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ
وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِى الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ
كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ
مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ
وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَاۤ اِلَّا
مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۲۰﴾ سَابِقُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ
عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ
ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۲۱﴾ مَاۤ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِى الْاَرْضِ
وَلَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ؕ اِنَّ
ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۚ﴿۲۲﴾ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ
وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۙ﴿۲۳﴾
الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّ
فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ﴿۲۴﴾

ع ۲ ۹ ۱۸

کیا ان لوگوں کے لیے جو ایمان لائے وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل اللہ کی یاد دہانی اور اس حق کے آگے جھک جائیں جو نازل ہو چکا ہے اور ان لوگوں کی طرح نہ بن کے رہ جائیں جن کو اس سے پہلے کتاب دی گئی پس ان پر طویل مدت گزر گئی، بالآخر ان کے دل سخت ہو گئے اور ان میں سے بہتیرے نافرمان ہیں۔ ۱۶

یاد رکھو کہ اللہ زندہ کر دیتا ہے زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد۔ ہم نے تمھارے لیے اپنی آیتیں واضح کر کے بیان کر دی ہیں تاکہ تم سمجھو۔ ۱۷

بے شک اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے مرد اور عورتیں اور وہ لوگ جنھوں نے اللہ کو قرض دیا اچھا قرض، ان کا دیا ہوا ان کے لیے بڑھایا جائے گا اور ان کے لیے باعزت صلہ ہے اور جو لوگ ایمان لائے اللہ اور اس کے رسولوں پر وہی لوگ اپنے رب کے ہاں صدیقوں اور شہداء کے زمرے میں ہوں گے۔ ان کے لیے ان کا صلہ بھی ہوگا اور ان کی روشنی بھی۔ رہے وہ جنھوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کی تکذیب کی وہ جہنم والے بنیں گے۔ ۱۸-۱۹

جان رکھو کہ دنیا کی زندگی ——— لہو و لعب، زیب و زینت اور مال و اولاد کے معاملے میں باہمی تفاخر و تکاثر ——— کی تمثیل اس بارش کی ہے جس کی اگجائی ہوئی فصل کاشتکاروں کے دل کو موہ لے، پھر وہ بھڑک اٹھے اور تم اسے زرد دیکھو، پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے اور آخرت میں ایک عذابِ شدید بھی ہے اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی بھی، اور دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کی ٹٹی ہے۔ ۲۰

تم مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور ایک ایسی جنت کی طرف جس کا طول و

عرض آسمان و زمین کے طول و عرض کے مانند ہوگا۔ وہ تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لیے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان رکھتے ہیں یہ اللہ کا فضل ہے، اس کو بخشے گا وہ جس کو چاہے گا اور اللہ بڑا ہی فضل والا ہے۔ ۲۱

اور تمھیں کوئی مصیبت بھی نہیں پہنچتی ہے، نہ زمینی پیداوار میں اور نہ تمھارے اپنے نفوس کے اندر مگر یہ کہ وہ لکھی ہوئی ہے ایک کتاب میں اس سے پہلے سے کہ ہم اس کو وجود میں لائیں اور یہ اللہ کے لیے نہایت آسان ہے۔ یہ بات تمھیں اس لیے بتائی جا رہی ہے کہ جو چیز جاتی رہے اس پر غم نہ کرو اور نہ اس چیز پر اتراؤ جو اس نے تمھیں بخشی ہے۔ اور یاد رکھو کہ اللہ اکڑنے والوں اور فخر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ جو خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں اور جو اعراض کریں گے وہ یاد رکھیں کہ اللہ بے نیاز و ستودہ صفات ہے۔ ۲۲-۲۴

۵- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمۡ یَاۡنِ لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُہُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰہِ وَ مَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ ۙ وَ لَا یَکُوۡنُوۡا کَالَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلُ فَطَالَ عَلَیۡہِمُ الۡاَمَدُ فَقَسَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ ؕ وَ کَثِیۡرٌ مِّنۡہُمۡ فٰسِقُوۡنَ (۱۶)

منافقین کے سامنے ایمان کے تعلق ذمہ کی وضاحت

'لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا' سے مراد، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، وہی منافقین ہیں جن کا رویہ یہاں زیر بحث ہے، چونکہ وہ ایمان کے مدعی تھے اس وجہ سے ان کے دعوے کے مطابق ان کا ذکر 'لِلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا' کی صفت سے کیا تاکہ وہ ان مطالبات پر سنجیدگی سے غور کریں جو اس دعوائے ایمان کے تعلق سے ان پر عائد ہوتے ہیں اور اگر ان کے اندر اس دعوے کی کچھ لاج ہے تو اس کا حق ادا کریں۔

'اَلَمۡ یَاۡنِ' کے اسلوب بیان سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ سورہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب دعوتِ حق کی صداقت و حقانیت اور اس کے غلبہ کے اتنے آثار و شواہد نمایاں ہو چکے

تھے کہ جن کے اندر کچھ شکوک وشبہات تھے وہ دور ہو جانے چاہیے تھے۔ اگر اتنے آثار دیکھ لینے کے بعد بھی ان کے شبہات علیٰ حالہٖ باقی ہی رہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس وقت تک شرحِ صدر کے ساتھ اسلام کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھے جب تک وہ اس کے ہر دعوے کی صداقت اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ اس طرح کا ایمان اللہ تعالیٰ کے ہاں معتبر نہیں ہے اس وجہ سے ان لوگوں کو دھمکی دی گئی ہے کہ اگر اب بھی وہ شبہات ہی میں مبتلا رہے تو ان کا وہی حال ہوگا جو یہود کا ہوا۔ وہ بھی برابر شبہات میں مبتلا رہے اور اسی حالت میں ان پر ایک مدت گزر گئی بالآخر ان کے دل سخت ہو گئے۔ یہاں تک کہ حق کی روئیدگی کی صلاحیت ہی ان کے اندر سے ختم ہو گئی اور اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں پر مہر کر دی جس کی تفصیل سورۂ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔

ایک سنتِ الٰہی

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ کسی امرِ حق میں شبہ و تردد کا پیدا ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اور نہ کچھ عرصے تک اس کا باقی رہنا کوئی قابلِ ملامت چیز ہے۔ ایک نیک نیت آدمی کے اندر بھی یہ حالت پیدا ہو سکتی ہے لیکن کوئی شخص اگر ان شبہات کی آڑ لے کر اپنے اندر حق کی آواز کو برابر دباتا ہی رہے اور اس کو باطل سے چمٹے رہنے کے لیے ایک بہانہ بنالے تو سنتِ الٰہی کے مطابق ایسا شخص قبولِ حق کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کسی شخص کی طرف سے حق کی ناقدری کو زیادہ عرصے تک گوارا نہیں فرماتا۔

شک کی بیماری مہلک ہے

'اَنۡ تَخۡشَعَ قُلُوۡبُہُمۡ لِذِکۡرِ اللّٰہِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الۡحَقِّ' میں 'ذِکۡرِ اللّٰہِ' اور 'حق' سے مراد تو قرآن مجید ہی ہے لیکن قرآن کے دو خاص پہلوؤں کی طرف توجہ دلانے کے لیے دو الگ الگ لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ 'ذِکۡرِ اللّٰہِ' سے مراد وہ تنبیہات ہیں جو ان خطرات و مہالک سے آگاہ کرنے کے لیے نازل ہوئی ہیں جن سے ان لوگوں کو دنیا اور آخرت دونوں میں لازماً دوچار ہونا پڑے گا جو حق سے اعراض کے لیے بہانے ڈھونڈتے رہیں گے اور 'حق' سے وہ کلیات مراد ہیں جو قرآن نے از سرِ نو باطل سے الگ کر کے اجاگر کیے۔ فرمایا کہ ان کی تائید میں اتنے شواہد و قرائن ظاہر ہو چکے ہیں کہ چاہیے تھا کہ لوگوں کے دل ان کے آگے سرفگندہ ہو جاتے۔ اگر اب بھی نہیں ہوئے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ لوگ اس بیماری میں مبتلا ہیں جس میں یہود مبتلا ہوئے۔

یہود کے متعلق پیچھے، مختلف سورتوں میں تفصیل سے یہ بات گزر چکی ہے کہ وہ شک کے ایسے مریض تھے کہ اپنے پیغمبر کی موجودگی میں، قدم قدم پر، اس کے معجزات اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں کو دیکھتے ہوئے، برابر بے یقینی اور تردد میں مبتلا رہے۔ یہاں تک کہ ان کی اسی بیماری نے ان کو تورات سے محروم کر دیا اور اسی کی پاداش میں ان کی اکثریت قرآن سے بھی محروم رہی۔ یہاں اسی روش بد اور اس کے انجام سے قرآن نے ان منافقین کو متنبہ کیا ہے کہ تم بھی یہود ہی کی طرح، اپنے رسول کی موجودگی میں، بے یقینی

کے مرض میں مبتلا ہو، ایسا نہ ہو کہ یہ مرض تمہارے لیے بھی اسی طرح مہلک بن جائے جس طرح ان کے لیے مہلک بنا۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ (۱۷)

یہ آیت یہاں نہایت ہی برمحل وارد ہوئی ہے اور اس میں دو مختلف پہلوؤں سے اس بے یقینی کا علاج مضمر ہے جس میں یہ منافقین مبتلا تھے۔

بے یقینی کا علاج

سب سے نمایاں پہلو تو یہ ہے کہ آدمی میں اگر آخرت کا یقین نہ ہو تو اس کے لیے جان یا مال کی قربانی نہایت کٹھن کام ہے۔ ان منافقین کی اصل بیماری یہی تھی کہ ان کے اندر آخرت کا یقین نہیں تھا اس وجہ سے وہ قرآن کے وعدوں کو محض ایک بہلاوا خیال کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ بے یقینی دور کرنے کے لیے اپنی ان نشانیوں اور دلیلوں کی طرف توجہ دلائی جو قیامت کے ایک معلوم و مشہود حقیقت ہونے پر اس نے نہایت تفصیل سے اپنی کتاب میں بیان فرمائی ہیں۔ یہاں چونکہ مقصود محض آخرت کے ایک امر واقعی ہونے کی یاددہانی ہے اس وجہ سے اس کے امکان کی ایک بدیہی دلیل کی طرف اشارہ کر کے بالاجمال یہ فرما دیا کہ اس کی دلیلیں ہم تفصیل سے قرآن میں بیان کر چکے ہیں، ان کو مستحضر کرو اور سمجھو تاکہ تمہارے اندر جان و مال کی قربانی کا حوصلہ پیدا ہو۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ منافقین مخالفینِ اسلام کی سطوت سے بہت مرعوب تھے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ مٹھی بھر مسلمان اعدا کی دل بادل افواج سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکیں گے اور کس طرح مکہ سے قریش کی جمی جمائی حکومت اکھاڑ کر بیت اللہ کو پھر دعوتِ ابراہیمی کا مرکز بنا سکیں گے، جیسا کہ ان کا دعویٰ ہے۔ اگرچہ اس سے پہلے بعض جنگیں ہو چکی تھیں جن میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا تھا لیکن منافقین کے دلوں سے ابھی ڈر نہیں نکلا تھا۔ اسلام کے مستقبل کی طرف سے وہ بدستور مایوسی و بے یقینی میں مبتلا تھے۔ ان کی اس مایوسی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو زمین کی نشانی کی طرف توجہ دلائی کہ جس خدا کی یہ شان برابر دیکھتے ہو کہ وہ مردہ زمین کو زندہ کر دیتا ہے اس کی قدرت سے بعید نہ سمجھو کہ وہ اس کفرستانِ عرب کو از سرِ نو ایمان و اسلام کی زندگی سے معمور کر دے۔

اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ (۱۸)

یہ آیت ۱۱ کے مضمون کو ایک دوسرے پہلو سے لیا ہے اور منافقین کو ابھارا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا خسارے کا سودا نہیں بلکہ نہایت نفع بخش کاروبار ہے۔ جو لوگ برابر صدقہ کرتے رہتے ہیں اور جب کبھی کسی ہنگامی ضرورت کے موقع پر ان سے مدد کی اپیل کی جائے تو اس وقت بھی وہ فراخ دلی سے مدد کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، ایسے لوگوں کی پائی پائی خدا کے ہاں محفوظ ہے۔ وہ ان کے لیے

اس کو بڑھا رہا ہے اور بڑھا کر ایک لازوال خزانے کی شکل میں ان کو واپس کرے گا۔ علاوہ ازیں ان کے لیے ایک بہت بڑا با عزت اجر بھی ہے۔ یعنی ان کا دیا ہوا تو کئی گنا بڑھ کر ان کو واپس کیا جائے گا ہی، اس کے علاوہ بھی رب کریم ان کو خاص اپنے پاس سے ایک اجرِ عظیم دے گا۔

صدقہ اور قرض

یہاں انفاق کے لیے صدقہ اور قرض کے دو لفظ استعمال ہوتے ہیں۔ پہلا فاعل یا صفت کی شکل میں دوسرا فعل کی صورت میں۔ اس اختلاف کی وجہ میرے نزدیک یہ ہے کہ ایک انفاق تو وہ ہے جس کا مطالبہ ہر ذی استطاعت مسلمان سے عام حالات میں ہے اور جو تزکیۂ نفس کے پروگرام کا ایک لازمی حصہ ہے۔ دوسرا وہ انفاق ہے جس کا مطالبہ کسی ناگہانی ضرورت کے موقع پر ملت کے تحفظ کے لیے کیا جاتا ہے۔ پہلے کو یہاں صدقہ کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور اس کے لیے فاعل اور صفت کے صیغے استعمال ہوئے ہیں اس لیے کہ وہ دواماً مطلوب ہے۔ دوسرے کو قرض سے تعبیر فرمایا ہے جو عندالضرورت دیا جاتا ہے اس وجہ سے اس کے لیے فعل کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔

مردوں کے ساتھ یہاں عورتوں کے خاص طور پر ذکر کی حکمت

ان آیات میں یہ امر بھی خاص توجہ کے لائق ہے کہ نفاق اور انفاق کے بیان میں قرآن نے مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں کی ذمہ داری خاص طور پر نمایاں فرمائی ہے۔ اس کی وجہ، غور کرنے سے، یہ معلوم ہوتی ہے کہ بیوی بچے بخل اور بزدلی کے بڑے اہم عوامل میں سے ہیں اور یہی دو چیزیں دراصل نفاق میں مبتلا کرنے والی ہیں۔ یہ حقیقت حدیث شریف میں بھی واضح فرمائی گئی ہے کہ بیوی بچے بخل و بزدلی کے سبب بنتے ہیں۔ اسی پہلو کے سبب سے یہاں منافقین کے ساتھ منافقات اور مصدقین کے ساتھ مصدقات کا ذکر خاص اہتمام کے ساتھ ہوا ہے تاکہ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں پر بھی یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر شخص اپنی ذمہ داریوں سے متعلق مسئول ہوگا، مرد ہو یا عورت۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ (۱۹)

قرینہ دلیل ہے کہ جس طرح آیت ۷ میں لفظ ایمان اپنے کامل مفہوم میں استعمال ہوا ہے اسی طرح اس آیت میں بھی اپنے حقیقی معنی میں استعمال ہوا ہے۔

منافقین کو ایک تنبیہ

یہ منافقین کو بتایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں صدیقین اور شہداء کے لیے جو درجے ہیں وہ ہر مدعیٔ ایمان کو نہیں حاصل ہو جائیں گے بلکہ یہ صرف ان لوگوں کے لیے خاص ہیں جو اللہ اور اس کے رسولوں پر سچا اور پکا ایمان لائیں گے اور اپنے عمل سے اپنے دعوائے ایمان کی صداقت ثابت کریں گے۔ یہاں چونکہ زیرِ بحث خاص طور پر انفاق ہے اس وجہ سے یہ بات آپ سے آپ نکلی کہ جو لوگ دین کی نصرت کے لیے فراخ دلی سے اپنے مال خرچ کریں گے درحقیقت وہی لوگ اپنے دعوائے ایمان میں سچے ہیں

اور وہی لوگ ہیں جن کو صدیقین اور شہداء کے زمرے میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہوگی۔

صدیق کی تعریف

لفظ 'صدیق' کی تحقیق اس کے محل میں ہو چکی ہے کہ اس کی اصل روح قول و عمل کی کامل مطابقت اور اس کی پختگی ہے۔ عربی میں اس نیزے کو 'صادق الکعوب' کہیں گے جس کی گرہیں تجربہ سے بھی ویسی ہی محکم ثابت ہوں جیسے وہ دیکھنے میں نظر آتی ہیں۔ صادق اور صدیق اس شخص کو کہیں گے جو اپنے قول کا پکا ہو۔ اس پختگی کی اوّلین عملی شہادت یہ ہے کہ وہ اس مقصدِ حق کی خاطر اپنی محنت کی کمائی قربان کرنے والا ہو جس کا اس نے اقرار و اعلان کیا ہے۔ اسی قربانی سے وہ اس مقصدِ حق کی شہادت دینے والا بنتا ہے اور ایسے ہی مردِ حق سے یہ توقع ہوتی ہے کہ اس کو امتحان پیش آیا تو وہ اپنی جان دے کر بھی اس حق کی شہادت دے گا۔ اسلام میں اس وصف کے سب سے نمایاں مصداق حضرت ابوبکر صدیقؓ ہیں جنھوں نے اپنے اقرارِ ایمان کی صداقت، نازک سے نازک زمانے میں، اپنے انفاق سے جس طرح ثابت کی ہے وہ ہماری تاریخ کا سب سے زیادہ روشن باب ہے۔

شہید

'شُهَدَآءُ' یہاں اسی معنی میں استعمال ہوا ہے جس معنی میں وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا (البقرۃ ۲: ۱۴۳) (اسی طرح ہم نے تم کو وسط راہ پر قائم رہنے والی امت بنایا کہ تم لوگوں پر اللہ کے دین کی گواہی دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دینے والا بنے) میں استعمال ہوا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس امت کو 'شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ' ہونے کا جو عظیم اعزاز حاصل ہے وہ مجرد ایمان کا دعویٰ کر دینے سے کسی کو نہیں حاصل ہو جائے گا بلکہ یہ صرف انہی کو حاصل ہوگا جن کا ہر ہر عمل ان کے ایمان کی گواہی دے۔ یہاں یہ امر بھی واضح رہے کہ خدا کی راہ میں مارے جانے والوں کو جو شہید کہتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ شہادت علی الناس کے فرضِ منصبی کا حق اس راہ میں اپنی جان قربان کر کے دیتے ہیں۔ یہ شہادت چونکہ سب سے بڑی شہادت ہے اس وجہ سے ان کو شہید کہتے ہیں۔

بعینہٖ یہی بات ان منافقین ہی کو خطاب کر کے سورۂ نساء میں یوں فرمائی گئی ہے۔

وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ	اور جو پوری وفاداری سے اللہ اور رسول کی
مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ	اطاعت کریں گے وہی لوگ اللہ کے انعام یافتوں،
النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ	انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے ساتھ
وَالصّٰلِحِيْنَ (النسآء - ۴ : ۷۰)	ہوں گے۔

'لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ' یعنی اوپر آیات ۱۱-۱۲ میں جو اجر اور جو نور بیان ہوا ہے وہ انہی جاں بازوں کے لیے ہے۔ ہر مدعی ان کا حق دار نہیں بن جائے گا۔

'وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ' یعنی وہ سارے لوگ جو کفر اور تکذیب،

کے مرتکب ہوئے وہ جہنم میں پڑیں گے۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ یہی حکم ان لوگوں کا بھی ہوگا جنھوں نے اگرچہ زبان سے تکذیب نہ کی ہو لیکن اپنے عمل سے تصدیق بھی نہ کی ہو بلکہ ان کا عمل ان کے دعوے کے بالکل برعکس ہی رہا ہو۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ کَمَثَلِ غَیْثٍ اَعْجَبَ الْکُفَّارَ نَبَاتُہٗ ثُمَّ یَھِیْجُ فَتَرٰىہُ مُصْفَرًّا ثُمَّ یَکُوْنُ حُطَامًا ؕ وَفِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (۲۰)

زرپرستوں کو تنبیہ

یہاں مال پرست منافقین کو تذکیر و تنبیہ ہے کہ اس دنیا کی زندگی، یعنی لہو و لعب، زینت و آرائش کا شوق، مال و اولاد کی تکثیر کی بھاگ دوڑ اور معیار زندگی اونچا کرنے کا باہم مقابلہ، جن میں جو تم ہر وقت ڈوبے ہوئے ہو، یہ کوئی خوش انجام سرگرمی نہیں ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ بارش اچھی ہو جائے جس سے فصل لہلہا اٹھے اور اس کو دیکھ کر ناشکرے لوگ پھولے نہ سمائیں لیکن پھر اس پر کوئی ایسی افتاد آپڑے کہ وہ سوکھ کر زرد ہو جائے پھر ریزہ ریزہ ہو جائے۔ یہی حشر تمھاری ان تمام سرگرمیوں کا ہونا ہے جو تم اس دنیا کے حاصل کرنے اور اس میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لیے کر رہے ہو۔ ان میں سے کوئی چیز بھی باقی رہنے والی نہیں ہے۔

وَفِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَۃٌ مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ۔ یعنی تم نے اپنی نادانی سے اس دنیا کی لذات کو زندگی کا مقصود، اپنی تمام مساعی کا حاصل اور گول قرار دے رکھا ہے حالانکہ یہ دنیا محض ایک سرمایۂ غرور اور دھوکے کی شئے ہے۔ اصل گول تو آخرت ہے اور وہاں دو چیزوں میں سے ایک سے سابقہ پیش آنا ہے۔ ایک طرف عذاب شدید ہوگا، دوسری طرف اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور اس کی خوشنودی۔ اگر کوئی شخص اس دنیا کے متاع کو قربان کر کے اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور خوشنودی کے حصول کا حوصلہ نہیں کر پائے گا تو وہ لازماً اس کے عذاب شدید سے دوچار ہوگا

ایک خاص نکتہ

اس آیت میں تالیف کلام عام مفسرین کے نزدیک تو اس طرح ہے کہ وہ اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا کو مبتدا اور اس کے بعد کی ساری عبارت کو خبر قرار دیتے ہیں لیکن میرے نزدیک اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا کے بعد لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّزِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِی الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ کے الفاظ بطور بدل بیان آئے ہیں اور کَمَثَلِ غَیْثٍ ...... الایۃ اس مبتدا کی خبر ہے۔ اس اسلوب کلام کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ہیں، مثلاً لَنَسْفَعًۢا بِالنَّاصِیَۃِ ۙ نَاصِیَۃٍ کَاذِبَۃٍ خَاطِئَۃٍ (العلق ۹۶: ۱۵-۱۶) (ہم اس کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹیں گے، جھوٹی، نابکار، گنہگار چوٹی)۔ اس تالیف کلام سے معنی میں بڑا فرق پیدا ہو جائے گا۔ مفسرین کے نزدیک تو آیت کا مطلب یہ

ہے کہ یہ دنیا کی زندگی محض لہو و لعب، زینت و آرائش اور تفاخر و تکاثر ہے۔ میرے نزدیک مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی یعنی لہو و لعب، زینت و آرائش اور تفاخر و تکاثر کی تمثیل یوں ہے جس طرح .....

مفسرین کی تاویل کی رو سے یہ دنیا اور اس کی زندگی بحیثیتِ مجموعی ایک قابلِ نفرت و لعنت چیز ٹھہرتی ہے اور اس سے اسی رہبانی تصور کی تائید نکلتی ہے جس کی قرآن نے پوری شدت سے آگے اسی سورہ میں تردید کی ہے۔ اور اگر وہ تاویل لی جائے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے تو اس سے دنیا بحیثیتِ مجموعی نہیں بلکہ اس کا صرف وہ پہلو قابلِ نفرت قرار پائے گا جس پر کفار و منافقین ریجھتے ہیں اور جو ان کو جہنم میں لے جانے کا سبب بنتا ہے۔

فلسفۂ دین کے نقطۂ نظر سے غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ یہ دنیا اور اس کی زندگی بجائے خود لعنت نہیں ہے بلکہ اس کے لعنت یا رحمت ہونے کا تعلق انسان کے رویہ سے ہے۔ اگر انسان ان حدود کے اندر زندگی گزارے جو اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں تو اس دنیا کی حیاتِ چند روزہ اس کے لیے آخرت کی ابدی بادشاہی کی ضامن ہے اور اگر وہ ان حدود سے بے پروا ہو کر اس کو خود معبود بنا بیٹھے اور اس کی لذتوں میں کھو جائے تو یہ اس کے لیے ابدی لعنت بن جاتی ہے۔ اس آیت میں اس کے اسی پہلو سے ہوشیار کیا گیا ہے۔

ایک اور نکتہ

آیت میں لفظ 'کفار' بھی قابلِ غور ہے۔ اس کے معنی مفسرین نے عام طور پر 'زرّاع' یعنی کسانوں کے لیے ہیں لیکن دل اس پر نہیں جمتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لفظ اس معنی میں معروف نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ جس مادے سے ہے اس کے اندر یہ معنی لینے کی گنجائش بھی ہے لیکن محض اتنی بات ایک ایسے لفظ کو، جو ایک اصطلاح کی حیثیت سے، ایک خاص مفہوم میں قرآن میں کثرت سے استعمال ہوا ہے، ایک ایسے شاذ معنی میں لینے کے لیے کافی نہیں ہے جس معنی میں اس کی کوئی اور مثال قرآن میں نہیں ہے۔ سورۂ فتح کی آیت فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ (۲۹) (پس وہ کھیتی اپنے تنوں پر کھڑی ہو گئی کسانوں کے دلوں کو بھاتی ہوئی کہ ان سے کافروں کے دل آزردہ ہوں) میں دونوں لفظ اپنے اپنے خاص معنوں میں استعمال ہوئے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں اپنے معانی میں معروف و متعین ہیں۔ اس وجہ سے میرا ذہن اس طرف جاتا ہے کہ یہاں 'کفار' اپنے اصل مفہوم ہی میں ہے، چونکہ اس تمثیل میں پیشِ نظر منکرینِ آخرت ہی کے رویہ کو نمایاں کرنا ہے اس وجہ سے فرمایا کہ اس دنیا کی عارضی رونقیں منکرینِ آخرت کے دلوں کو لبھا لیتی ہیں، وہ انہی کے اندر پھنس کے رہ جاتے ہیں اور بالآخر اس عذاب سے دوچار ہوتے ہیں جو اس قسم کے محروم القسمت لوگوں کے لیے مقدر ہے۔ یہ امر یہاں ملحوظ رہے کہ تمثیل و تشبیہ میں بعض اوقات ایسے الفاظ داخل کر دیے جاتے ہیں جن سے مقصود ان لوگوں کی طرف اشارہ کرنا ہوتا ہے جو اس تشبیہ یا تمثیل میں پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ اس طرح کی بعض چیزوں کی طرف

ہم پیچھے اشارہ کر چکے ہیں ان پر نگاہ رکھنا ضروری ہوتا ہے ورنہ تشبیہ یا تمثیل کا اصل حسن ظاہر نہیں ہوتا۔ یہاں یہ لفظ استعمال کر کے ان لوگوں کا سراغ دے دیا گیا ہے جو تمثیل میں پیشِ نظر ہیں۔

سَابِقُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا کَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ ۙ اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ ؕ ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ (۲۱)

اصل میدانِ مسابقت

اوپر کی آیت میں بتایا کہ اہلِ کفر کی بھاگ دوڑ اور ان کا تکاثر و تفاخر تو بس اسی دنیا کی عارضی و فانی مطلوبات و مرغوبات کی راہ میں ہے، وہ ان سے آگے جانے کا حوصلہ اپنے اندر نہیں رکھتے لیکن اہلِ ایمان کا نصب العین اپنے رب کی مغفرت اور اس کی خوشنودی ہونا چاہیے اور اس دنیا کی تنگ نائے کی جگہ انھیں اس جنت کے حصول کے لیے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرنی چاہیے جس کا طول و عرض آسمانوں اور زمین کے طول و عرض کے برابر ہے اور جو ان مومنین صادقین کے لیے اللہ نے تیار کر رکھی ہے جو اللہ اور اس کے رسولوں پر سچا اور پکا ایمان رکھنے والے ہیں۔

لفظ 'عَرْض' یہاں قرینہ دلیل ہے کہ طول و عرض یعنی وسعت اور پہنائی کے مفہوم میں ہے اور 'سَمَآء' جنس یعنی 'سَمٰوٰت' کے معنی میں ہے چنانچہ دوسرے مقام میں یہی مضمون جمع کے لفظ سے بیان ہوا ہے: 'وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ' (آل عمران - ۳: ۱۳۳) (اور مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور ایک ایسی جنت کے لیے جس کی وسعت آسمانوں اور زمین کے مانند ہوگی)۔

'اُعِدَّتْ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ' یعنی اس کو بہت دور کی چیز نہ سمجھو، یہ اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے والوں کے لیے تیار کی ہوئی موجود ہے۔ جونہی اس دنیا کا امتحان ختم ہوا ہر ایک کے سامنے اس کی جنت بے نقاب ہو جائے گی۔ اور اس بات پر بھی تعجب نہ کرو کہ چند دنوں کی نیکیوں کے صلہ میں اللہ تعالیٰ ہر ایک کو ایسی ناپیدا کنار جنتیں دے گا۔ اللہ بڑے فضل والا ہے، وہ جس کو چاہے بخشے۔ اس کے پاس کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔

مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ؕ اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ (۲۲)

تقدیر کا نوشتہ اٹل ہے

یعنی یہ حقیقت بھی ہمیشہ پیشِ نظر رکھو کہ جو مالی یا جانی مصیبت بھی تمھیں پیش آتی ہے وہ پیش آ کے رہے گی، تم اس سے بچنے کے کتنے ہی جتن کرو لیکن اس سے بھاگ نہیں سکتے۔ ہر دکھ اور سکھ اللہ تعالیٰ نے پہلے سے ایک کتاب میں لکھ رکھا ہے اور یہ کسی کے امکان میں نہیں ہے کہ وہ نوشتہ تقدیر کو بدل سکے۔ اللہ تعالیٰ کا علم حاضر و مستقبل سب پر محیط ہے اس وجہ سے اس کے لیے یہ کام ذرا

بھی مشکل نہیں ہے۔ تم اپنے محدود علم پر قیاس کر کے اس کو بعید از امکان خیال کرتے ہو لیکن اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے۔ اس کے لیے یہ معمولی بات ہے کہ وہ جس کو وجود بخشے اس کے وجود سے پہلے ہی اس کی تقدیر بھی لکھ دے۔

یہاں دعوتِ انفاق کے ذیل میں اس نکتہ کی وضاحت اس وجہ سے ضروری ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں انفاق مال و جان سے جی وہی لوگ چراتے ہیں جو اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ ان کو جو مال حاصل ہوتا ہے وہ ان کی اپنی تدبیر سے حاصل ہوتا ہے اور جو زندگی عطا ہوئی ہے اس کے محافظ وہ خود ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے فرمایا کہ مال، اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے اس وجہ سے یہ انتہائی نادانی ہے کہ اس کو خدا سے بچانے کی کوشش کی جائے۔ جو چیز خدا ہی کی بخشش سے ملی ہے اس کو کوئی خدا سے کس طرح بچا سکتا ہے؟ اگر وہ اللہ کے حق میں بخالت کرے گا تو ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب چاہے کوئی آفت بھیج کر اس کا مال چھین لے۔ انسان کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ اپنا فرض ادا کرے اور اپنے رب سے یہ امید رکھے کہ جس طرح اس نے آج اپنی مدد سے نوازا ہے اسی طرح آئندہ بھی ہر مشکل میں وہ مدد فرمائے گا۔ قرآن کے دوسرے مقامات میں منافقوں اور بخیلوں کا یہ کردار بیان ہوا ہے کہ وہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے اس اندیشہ سے جی چراتے ہیں کہ کل کو اگر کوئی افتاد پیش آئی تو کیا بنے گا۔ گویا وہ اپنی بخالت کو آئندہ پیش آنے والی مشکلوں اور گردشوں کا علاج سمجھتے ہیں۔ حالانکہ جو کچھ پیش آنا ہے وہ اٹل ہے۔ اس کا علاج خدا سے بخالت نہیں بلکہ اس کی راہ میں انفاق اور اسی پر توکل ہے۔

'فِی الْاَرْضِ' سے یہاں اشارہ ان مالی قسم کی آفتوں کی طرف ہے جو زمین کی پیداوار کو لاحق ہوتی ہیں اور 'فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ' سے وہ تکلیفیں اور مصیبتیں مراد ہیں جو جسم اور جان کو لاحق ہوتی ہیں۔ اس دنیا میں انسان کو جو آزمائشیں بھی پیش آتی ہیں انہی دونوں راہوں سے پیش آتی ہیں فرمایا کہ ان دونوں ہی راہوں سے جو کچھ بھی پیش آنے والا ہے وہ پہلے سے اللہ تعالیٰ کے ہاں نوشتہ ہے۔ اس وجہ سے انسان کے لیے نہ یہ جائز ہے کہ وہ اپنے رب سے اپنا مال چرائے اور نہ یہ جائز ہے کہ وہ اس سے اپنی جان چرانے کی کوشش کرے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی وہ خدا سے بچا سکنے پر قادر نہیں ہے۔ انہی منافقین کو خطاب کر کے قرآن میں دوسری جگہ فرمایا ہے کہ آج تم خدا کی راہ سے جی چراتے اور موت سے ڈرتے ہو لیکن موت کا جو وقت مقرر ہے وہ اس وقت آ کے رہے گی اور تم کتنے ہی محکم قلعوں کے اندر چھپ کے بیٹھو لیکن وہ تم کو ڈھونڈ لے گی۔

'فِیْ کِتٰبٍ' سے مراد وہ کتاب ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کی تقدیر رقم فرما رکھی ہے۔ اس کو لوحِ محفوظ سے بھی تعبیر فرمایا گیا ہے اور اس سے مراد درحقیقت علمِ الٰہی ہے۔

إِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۔ یعنی تمہارا علم بہت محدود ہے اس وجہ سے تمہارے لیے یہ تصور کرنا بڑا مشکل ہے کہ ایک ایک فرد کی زندگی میں جو کچھ پیش آتا ہے وہ لکھا ہوا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے لیے یہ کام ذرا بھی مشکل نہیں ہے۔ وہ اس پوری کائنات کا خالق اور اس کا علم محیط کل ہے وہ ہر ایک کے متعلق جانتا ہے کہ وہ کن مراحل سے ہوتا ہوا کس منزل تک پہنچے گا۔

لِّكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۲۳-۲۴)

تقدیر کا فلسفہ

یہاں 'لِكَيْ' سے پہلے کچھ حذف ہے۔ اس کو کھول دیجیے تو پوری بات یوں ہوگی کہ اس موقع پر تمھیں اس حقیقت کی یاددہانی اس لیے کرائی جا رہی ہے کہ نہ تم کسی چیز کے فوت ہونے پر غم کرو اور نہ کسی چیز پر جو تمھیں ملے اتراؤ اور فخر کرو، بلکہ اس عقیدے کی روشنی میں تمہارا کردار یہ ہونا چاہیے کہ تمھیں کوئی جانی یا مالی نقصان پہنچے تو اس پر صبر کرو کہ یہ نوشتۂ تقدیر کے مطابق پہنچا ہے اور اسی میں اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے اور اگر کوئی نفع پہنچے تو اس پر اپنے رب کے شکرگزار ہو کہ اسی نے تمھیں اپنے فضل سے نوازا ہے، اس گھمنڈ میں مبتلا ہو کر اترانے نہ لگو کہ یہ تمھاری تدبیر و قابلیت کا ثمرہ اور تمھارے استحقاق کا کرشمہ ہے۔

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ ۔ جو لوگ اللہ کی بخشی ہوئی نعمتیں پا کر اکڑنے والے بن جاتے ہیں انھیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ کسی اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ 'پسند نہیں کرتا' کے الفاظ اگرچہ بظاہر نرم ہیں لیکن باعتبارِ معنی بہت سخت ہیں۔ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ بسا اوقات اس طرح کے منفی اسلوب میں جو بات کہی جاتی ہے اس کو مثبت اسلوب میں کہیں تو وہ یوں ادا ہوگی کہ 'اِنَّ اللّٰهَ يبغض كلَّ مختالٍ فخور' لیکن متکلم صاف لفظوں میں بات کہنے کے بجائے اپنے تیور اور لب و لہجہ سے اپنی شدتِ نفرت کا اظہار کر دیتا ہے۔

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۔ یہ ان کے اسی کردار کے دوسرے پہلو کی طرف اشارہ ہے کہ اس طرح کے لوگ چونکہ اس خبط میں مبتلا ہوتے ہیں کہ انھیں جو کچھ حاصل ہوتا ہے اپنی تدبیر سے حاصل ہوتا ہے اس وجہ سے وہ اپنی نمائش و آرائش اور تکاثر و تفاخر کے سوا دین و ملت کی راہ میں خرچ کرنے کو خسارہ اور تاوان سمجھتے ہیں۔ اس طرح کے کاموں میں وہ خود بھی بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتے ہیں تاکہ ان کی بخالت پر پردہ پڑا رہے۔ بخیلوں کے کردار کا یہ پہلو قرآن میں بعض جگہ واضح فرمایا گیا ہے کہ ان کی خواہش اور کوشش ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ جس طرح وہ بخیل ہیں اسی طرح دوسرے بھی بخیل بنے رہیں تاکہ ان کی بخالت پر پردہ پڑا رہے۔

لفظ 'امر' یہاں مشورہ دینے کے معنی میں ہے۔ اس معنی میں یہ لفظ معروف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ دوسروں کو دینی و ملی کاموں میں خرچ کرتے دیکھتے ہیں تو ان کو خیر خواہانہ انداز میں مشورے دیتے ہیں کہ بہت شاہ خرچ مت ہو ورنہ کوئی سخت وقت آپڑا تو پچھتاؤ گے اور اس وقت کوئی مدد کرنے والا نہیں بنے گا۔

'وَمَنْ يَتَوَلَّ فَإِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ'۔ یہ اس طرح کے بخیلوں سے نہایت تہدید آمیز الفاظ میں اظہارِ بے نیازی و اعلانِ بیزاری ہے کہ اگر یہ لوگ اس تذکیر و تعلیم کے بعد بھی اعراض ہی کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو وہ یاد رکھیں کہ خدا بھی ان سے بالکل بے نیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو انفاق کی دعوت دے رہا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کے خزانے میں کوئی کمی ہے بلکہ اس نے یہ اپنے بندوں کے لیے (جیسا کہ آیت ۱۸ میں بیان ہوا) ایک ابدی نفع کمانے کی راہ کھولی ہے۔

'غنی' کے ساتھ صفت 'حمید' اس حقیقت کے اظہار کے لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات میں بالکل بے نیاز و بے پروا ہے۔ اسے کسی کی حاجت نہیں۔ وہ لوگوں سے مانگتا ہے تو اس لیے نہیں کہ وہ ان کا محتاج ہے بلکہ وہ 'حمید' ہے اس وجہ سے وہ چاہتا ہے کہ اس طرح وہ لوگوں کو اپنے افضال کا حق دار بنائے اور ان کے دیے ہوئے خزف ریزوں کو ایک لازوال خزانے کی شکل میں تبدیل کر کے ان کو واپس کرے۔

۶- آگے آیات ۲۵-۲۹ کا مضمون

آگے خاتمۂ سورہ کی آیات ہیں جن میں اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کے اٹھائے ہوئے ایک اعتراض کا برمحل جواب دیا گیا ہے۔ اوپر کی آیات میں اہل ایمان کو جس انفاق کی دعوت دی گئی ہے اس کا تعلق، جیسا کہ سیاق و سباق سے واضح ہے، جہاد سے ہے۔ مسلمان جب تک مکہ میں مظلوم و مغلوب رہے اس وقت تک تو اہل کتاب اور قریش نے ان کی کمزوری اور بے بسی کو ان کے خلاف دلیل کے طور پر استعمال کیا لیکن جب انھوں نے مدینہ میں ایک منظم جمعیت کی شکل اختیار کر لی یہاں تک کہ انھوں نے قلتِ تعداد کے باوجود، قریش کو بعض جنگوں میں نہایت کھلی ہوئی شکست بھی دے دی تو قریش اور اہل کتاب دونوں نے مل کر ان کے جوشِ جہاد کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ یہ جماعت مذہبی جماعت کس طرح ہو سکتی ہے جب کہ اس کے نزدیک سب سے بڑا نیکی کا کام جنگ و خونریزی ہے، بھلا اللہ کے رسولوں اور اس کے نیک بندوں کو جنگ و خونریزی سے کیا تعلق، وہ تو دنیا میں امن و سلامتی اور صلح و محبت کے داعی ہوتے ہیں! اس دور میں مذہب کا رہبانی تصور ذہنوں پر غالب تھا اس وجہ سے قریش نے اہل کتاب کے اٹھائے ہوئے اس اعتراض کو اٹھا لیا۔ چنانچہ غزوۂ بدر کے موقع پر انھوں نے

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو طعنہ دیا کہ یہ اللہ کے رسول کس طرح ہو سکتے ہیں جب کہ انھوں نے بھائیوں کی تلوار بھائیوں ہی کی گردنوں پر چلوا دی۔ قرآن نے جگہ جگہ اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ سورۂ انفال اور سورۂ حج میں اس کے بعض اہم پہلو زیر بحث آ چکے ہیں۔ یہاں اس کے جواب میں انبیاء و رسل کی تاریخ کی روشنی میں تین باتیں واضح فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جتنے نبی اور رسول بھی بھیجے اس لیے بھیجے کہ لوگ ان کی ہدایات کی روشنی میں حق و عدل کی شاہراہ پر چلنے والے بنیں۔ اسی مقصد کے لیے اللہ نے ان پر اپنی کتاب نازل فرمائی تاکہ وہ کتاب ان کے لیے میزانِ حق کا کام دے اور وہ اس کسوٹی پر پرکھ کر لوگوں کو بتائیں کہ کیا حق ہے، کیا باطل، کیا عدل ہے، کیا ظلم؟

دوسری یہ کہ عدل و قسط کا قیام اس امر کو مستلزم ہے کہ ظلم و جور کا سدِّ باب کیا جائے۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ کتاب و میزان کے ساتھ قوت و طاقت بھی ہو تاکہ عدل کی مزاحم طاقتیں اس کے قیام میں مانع ہوں تو ان کو دبایا جا سکے۔ اس مقصد کے لیے اللہ تعالیٰ نے کتاب کے ساتھ لوہا بھی اتارا جس میں خلق کے لیے دوسرے گوناگوں فوائد کے ساتھ یہ فائدہ بھی ہے کہ اس سے وہ قوت حاصل کی جا سکتی ہے جو قیامِ حق و عدل کی راہ میں جہاد کے لیے ضروری ہے۔ یہ جہاد اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کا ایک امتحان ہے جس سے وہ مخلصین و منافقین کو پرکھتا ہے کہ کون حق کی خاطر اپنی جان کی قربانی دے سکتے ہیں اور کون محض دکھاوے کے مسلمان ہیں۔

تیسری یہ کہ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام کی ذرّیت میں جتنے نبی و رسول بھی آئے سب اسی مقصدِ حق اور قیامِ عدل کے لیے آئے اور انہی کے طریقہ پر اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح ابن مریم کو بھی بھیجا۔ ان کے پیروؤں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر رافت و رحمت رکھی تھی جس کی آڑ میں ان کے بعد کے نام لیواؤں نے رہبانیت ایجاد کر لی جو محض ان کی اپنی ایجاد کردہ بدعت ہے۔ ان پر جو چیز فرض کی گئی تھی وہ تو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا طلبی تھی جو تمام نبیوں اور رسولوں کی مشترک تعلیم ہے لیکن اپنی غلو پسندی کے سبب انھوں نے اس کے حدود ملحوظ نہیں رکھے اور رہبانیت ایجاد کر کے خدا کے دین کا حلیہ بگاڑ ڈالا اور اب اسی بگڑے ہوئے دین کو دلیل بنا کر اسلام کے حکمِ جہاد پر اعتراض کر رہے ہیں۔

اس فتنۂ رہبانیت کے سبب سے سب سے زیادہ گمراہی چونکہ نصاریٰ ہی کو پیش آئی اس وجہ سے آخر میں ان کو خاص طور پر اسلام کی دعوت بھی دے دی گئی کہ جو لوگ حضرت مسیح علیہ السلام پر ایمان کے مدعی ہیں وہ رہبانیت وغیرہ جیسی بدعات میں پھنس کر اسلام کی نعمتِ عظمیٰ سے محروم نہ ہوں۔ اگر وہ اللہ کے آخری رسول پر ایمان لائیں گے تو اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے مطابق اپنی رحمت میں ان کو دو

حصے دے گا اور یہ یہود جو اللہ کے تمام فضل و رحمت کا اجارہ دار تنہا اپنے کو سمجھے بیٹھے ہیں حسد
کی اسی آگ میں جلتے رہیں گے جس میں وہ جل رہے ہیں۔ اس روشنی میں آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۲۵-۲۹

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَأَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيزَانَ
لِيَقُومَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ
وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۚ
إِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿۲۵﴾ وَلَقَدْ أَرْسَلْنَا نُوحًا وَّإِبْرٰهِيمَ
وَجَعَلْنَا فِي ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ
وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُونَ ﴿۲۶﴾ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا
وَقَفَّيْنَا بِعِيسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْإِنْجِيلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِي
قُلُوبِ الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ رَأْفَةً وَّرَحْمَةً ۚ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ
ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ إِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا
رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِينَ اٰمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ ۚ
وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُونَ ﴿۲۷﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ
وَاٰمِنُوا بِرَسُولِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ
لَّكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۲۸﴾
لِّئَلَّا يَعْلَمَ أَهْلُ الْكِتٰبِ أَلَّا يَقْدِرُونَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ
فَضْلِ اللّٰهِ وَأَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ ۚ
وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيمِ ﴿۲۹﴾

ع ۲ / ۶ / ۱۹ — ع ۴ / ۲۰

ترجمہ آیات ۲۵-۲۹

بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ

کتاب اور میزان نازل کی تاکہ لوگ عدل پر قائم ہوں اور لوہا بھی اتارا جس میں بڑی قوت بھی ہے اور لوگوں کے لیے اس میں دوسرے فوائد بھی ہیں اور اس سے اللہ نے یہ بھی چاہا کہ وہ ان لوگوں کو ممیز کرے جو اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد غیب میں ہوتے کرتے ہیں بے شک اللہ بڑا ہی زور آور اور غالب ہے۔ ۲۵

اور ہم نے نوح اور ابراہیم کو رسول بنا کر بھیجا اور ان دونوں کی ذرّیت میں نبوّت اور کتاب کا سلسلہ جاری کیا۔ پس ان میں سے کچھ تو ہدایت پانے والے بنے اور زیادہ ان میں نافرمان نکلے۔ پھر انہی کے نقشِ قدم پر ہم نے اپنے اَور رسول بھی بھیجے اور انہی کے نقشِ قدم پر بھیجا عیسیٰ ابنِ مریم کو بھی اور اس کو عنایت کی انجیل۔ اور ہم نے ان لوگوں کے دلوں میں جنھوں نے اس کی پیروی کی رافت و رحمت رکھی اور رہبانیت انھوں نے خود ایجاد کی۔ ہم نے ان کے اوپر صرف اللہ کی خوشنودی کی طلب فرض کی تھی تو انھوں نے اس کے حدود کما حقہٗ ملحوظ نہیں رکھے۔ تو ہم نے ان لوگوں کو جو ان میں سے ایمان پر جمے رہے ان کا اجر عطا فرمایا اور زیادہ ان میں نافرمان نکلے۔ اے وہ لوگو جو ایمان لائے اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ وہ تم کو اپنی رحمت میں سے دو حصّے دے گا اور تمھارے لیے روشنی بنائے گا جس کو لے کر تم چلو گے اور تمھاری مغفرت فرمائے گا۔ اللہ بڑا ہی غفور رّحیم ہے۔ تاکہ اہلِ کتاب نہ جانیں کہ وہ اللہ کے فضل میں سے کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتے اور یہ کہ فضل تمام تر اللہ ہی کے اختیار میں ہے، وہ بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ۲۶-۲۹

۷- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ (۲۵)

رسولوں کی بعثت کا مقصد

یہ رسولوں اور کتابوں کے بھیجنے کا مقصد واضح فرمایا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول بھیجے اور کتابیں نازل فرمائیں کہ لوگ زندگی کے ہر شعبہ میں حق و عدل کے اختیار کرنے والے بنیں۔ عقائد میں وہ راہ اختیار کریں جو ہر کج پیچ سے پاک، سیدھی اور بیچ (وسط) کی راہ ہو اور اعمال میں، خواہ وہ انفرادی زندگی سے متعلق ہوں یا اجتماعی زندگی سے، وہ روش اختیار کریں جو حق و عدل پر مبنی اور ظلم و جور کے ہر شائبہ سے پاک ہو۔ معلوم ہوا کہ اللہ نے اپنے رسول محض وعظ سنا دینے کے لیے نہیں بھیجے اور نہ اپنی کتابیں محض تلاوت کے لیے نازل کیں بلکہ ان کا اصل مقصد یہ تھا کہ لوگ ان کی رہنمائی میں حق و عدل پر قائم رہنے والے اور اس کو قائم کرنے والے بنیں۔

'کتٰب' کے ساتھ 'میزان' کا ذکر میرے نزدیک کتاب ہی کے سب سے بڑے مقصد کی وضاحت کے لیے ہے کہ وہ تول کر بتاتی ہے کہ کس کے ساتھ کتنا حق ہے اور اس میں کتنا غیر مطلوب اضافہ ہے۔ سورۂ شوریٰ میں کتاب الٰہی کے اس پہلو کو نہایت وضاحت سے بیان فرمایا گیا ہے۔[۱] وہاں پہلے یہ حقیقت واضح فرمائی گئی کہ اللہ کے تمام رسولوں نے صرف توحید کی تعلیم دی ہے اور اس راہ سے معمولی انحراف کو بھی نہایت شدت کے ساتھ روکا ہے۔ اس کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت فرمائی ہے کہ تم اسی راہ کی لوگوں کو دعوت دو اور اپنے مخالفوں کو آگاہ کر دو کہ میں اللہ کی اتاری ہوئی کتاب پر ایمان لایا ہوں تو تمھاری بدعتوں کی پیروی کس طرح کر سکتا ہوں۔ یہ کتاب دے کر اللہ تعالیٰ نے مجھے اس منصب پر مامور فرمایا ہے کہ میں تمھارے درمیان فیصلہ کروں اور اس میزان پر تول کر بتاؤں کہ تم میں سے کس کے پاس کتنا حق ہے اور کتنا باطل۔ اس بحث کا خاتمہ آیت ذیل پر ہوا ہے:

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ	اللہ ہی ہے جس نے اتاری ہے کتاب حق کے
بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ ۭ وَمَا	ساتھ اور جو فیصلہ کے لیے میزان ہے۔ اور تمھیں
يُدْرِيْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيْبٌ	کیا خبر کہ شاید قیامت کی گھڑی بھی (فیصلہ کے لیے)
(الشوریٰ - ۴۲: ۱۷)	قریب ہی آ لگی ہو۔

[۱] ملاحظہ ہو تدبر قرآن، جلد ششم، صفحات ۱۵۲۱-۱۵۷

اسی پہلو سے قرآن کو 'مھیمن' بھی کہا گیا ہے۔ 'مھیمن' کے معنی کسوٹی کے ہیں۔ یعنی قرآن ایک کسوٹی ہے جس پر پرکھ کر کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کیا جاتا ہے۔ عدل اور قسط کو قائم کرنے کے لیے میزان اور کسوٹی کا ہونا ضروری ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن کی یہ دونوں صفتیں واضح فرمائی ہیں۔

قیامِ عدل کے لیے طاقت کا ضرورت

'وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ فِیْہِ بَاْسٌ شَدِیْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ' یعنی جب رسولوں کی بعثت اور کتاب و شریعت کے نازل کرنے سے اصل مقصود قیامِ قسط ہوا تو یہ کام مجرّد وعظ و تذکیر اور انذار و تبشیر سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے طاقت کی بھی ضرورت ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ایک طرف تو رسولوں کو بیّنات یعنی نہایت واضح دلائل کے ساتھ اور کتابوں کو میزان اور کسوٹی بنا کر بھیجا تاکہ لوگوں پر عقلی و اخلاقی پہلو سے اچھی طرح حجّت تمام ہو جائے، دوسری طرف لوہا بھی اتارا کہ جو لوگ اتمامِ حجّت کے بعد بھی حق کے آگے جھکنے پر تیار نہ ہوں اور اپنے اغراض کے لیے خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے ہی پر تلے ہوں ان کو طاقت کے ذریعہ سے زیر کیا جائے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کی ہمیشہ سے یہ سنت رہی ہے کہ جب اس نے کسی قوم کی طرف اپنا رسول بھیجا تو اتمامِ حجّت کے بعد اس کو دو صورتوں میں سے کوئی نہ کوئی صورت ضرور پیش آئی۔ اگر اس کے اندر رسول پر ایمان لانے والوں کی تعداد بہت تھوڑی ہوئی، اکثریت کفر پر جمے رہ جانے والوں ہی کی ہوئی تو اللہ تعالیٰ نے کوئی ارضی و سماوی عذاب بھیج کر کفار کو تباہ کر دیا اور اپنے باایمان بندوں کو ان کے اندر سے نکال لیا اور اگر اس کے اندر ایمان لانے والوں کی تعداد بھی معتدبہ ہوئی تو رسول اور اس کے ساتھیوں کو کفّار سے جہاد بالسیف کا حکم دیا گیا جس کے نتیجہ میں بالآخر کفّار کا استیصال ہو گیا۔ قرآن مجید میں رسولوں کی جو تاریخ بیان ہوئی ہے وہ اس سنتِ الٰہی پر شاہد ہے اور ہم جگہ جگہ اس کے تمام پہلوؤں کی وضاحت کرتے آ رہے ہیں۔

ہر چیز کا منبع اللہ ہے

لوہا اگرچہ نکلتا زمین ہی سے ہے لیکن اس کے لیے لفظ 'اَنْزَلْنَا' استعمال ہوا ہے۔ یہ اسی طرح کا استعمال ہے جس طرح چوپایوں کے پیدا کیے جانے کے لیے یہ لفظ قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ مقصود اس سے ایک طرف تو اس عنایتِ خاص کی طرف توجہ دلانا ہے جو اس کے اندر انسانوں کی بہبود کے لیے مضمر ہے۔ دوسری طرف یہ لفظ ہر چیز کے اصل منبع و مصدر کا سراغ دیتا ہے کہ کوئی چیز کہیں سے حاصل ہو لیکن حقیقت میں وہ نازل خدا ہی کی طرف سے ہوتی ہے۔ جب تک انسان کی نظر اس پہلو پر نہ ہو وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی صحیح قدر و قیمت کا اندازہ نہیں کر سکتا۔

ایک نکتہ

اس ٹکڑے میں یہ چیز بھی قابلِ توجہ ہے کہ لفظ 'بَاْس' مقدم ہے لفظ 'مَنَافِع' پر۔ جس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک لوہے کی اصل افادیت جہاد کی قوت فراہم کرنا ہے۔ اس کے دوسرے تعمیری و تمدنی فوائد مزید برآں اور ضمنی ہیں۔

یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ قرآن نے یہاں لوہے کا ذکر اصل ابتدائی ذریعۂ جنگ کی حیثیت سے

کیا ہے۔ اس زمانے میں بیشتر اسلحۂ جنگ اسی سے بنتے تھے۔ اب لوہے کی حیثیت ثانوی رہ گئی ہے، اصل اہمیت دوسری چیزوں کو حاصل ہوگئی ہے۔ حالات کی تبدیلی سے ان دوسری چیزوں کو اب وہی اہمیت حاصل ہوجائے گی جو پہلے لوہے کو حاصل تھی۔

جہاد کی حکمت

وَلِیَعْلَمَ اللّٰہُ مَنْ یَّنْصُرُہٗ وَرُسُلَہٗ بِالْغَیْبِ ط اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ۔ یہ جہاد کی حکمت واضح فرمائی کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ خود قوی اور غالب ہے، وہ اپنے بڑے سے بڑے دشمن کو چشم زدن میں شکست دے سکتا ہے لیکن اس جہاد کے ذریعے سے وہ اپنے بندوں کا امتحان کرتا ہے کہ کون غیب میں ہوتے اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے اور کون محض دکھاوے کا مجنوں ہے جو امتحان میں پھسڈی ثابت ہوتا ہے۔ عَلِمَ یَعْلَمُ کے معنی کی وضاحت ہم کرچکے ہیں کہ یہ ممیز کردینے کے معنی میں آتا ہے۔ اللہ تعالیٰ جانتا تو سب کچھ ہے لیکن اس طرح کے امتحان کے ذریعہ سے وہ جھوٹے اور سچے میں امتیاز بھی کرادیتا ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِیْمَ وَجَعَلْنَا فِیْ ذُرِّیَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۲۶)

تاریخ انبیاء کا حوالہ

یہ تمام انبیاء کی تاریخ کا حوالہ ہے کہ اللہ نے جتنے نبی اور رسول بھی بھیجے اسی مقصد سے بھیجے کہ وہ لوگوں کو عدل و قسط کے قیام کی دعوت دیں لیکن ان کی ذریّت میں سے تھوڑے ایسے نکلے جو اس مقصد پر استوار رہے، اکثریت اپنی بدعت پسندیوں کے سبب سے اس نصب العین سے منحرف ہوکر نافرمان بن گئی۔

رسولوں میں سے یہاں نام کی تصریح کے ساتھ صرف دو رسولوں ـــــ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم علیہما السلام ـــــ کا ذکر فرمایا ہے۔ اس کی وجہ واضح ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی حیثیت آدم ثانی کی ہے اور بنی اسرائیل و بنی اسماعیل میں جو انبیاء آئے ان کے اولا آباء حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ ان دو کا ذکر ہوگیا تو گویا نبوت کے تمام سلسلوں کا ذکر ہوگیا۔ یہ آیت تمہید ہے اس مضمون کی جو آگے آرہا ہے۔

ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰۤی اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّیْنَا بِعِیْسَى ابْنِ مَرْیَمَ وَاٰتَیْنٰهُ الْاِنْجِیْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَرَهْبَانِیَّةَ ِۨابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا ۚ فَاٰتَیْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِیْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ (۲۷)

رہبانیت دین میں کس طرح گھسی

اب یہ بتایا جارہا ہے کہ جب تمام انبیاء کا طریقہ وہ رہا ہے جو اوپر بیان ہوا تو دین میں رہبانیت کی بدعت اور جہاد کو خلافِ دینداری قرار دینے کی ضلالت کہاں سے اور کس طرح گھسی؟ فرمایا کہ نوح

اور ابراہیمؑ کے بعد جتنے نبی بھی ہم نے بھیجے انہی کے نقشِ قدم پر بھیجے یعنی سب نے لوگوں کو نقطۂ عدل پر استوار ہونے کی دعوت دی اور اگر ضرورت داعی ہوئی تو انھوں نے قیامِ قسط کے لیے سنتِ انبیاء کے مطابق جہاد بھی کیا۔ ان میں سے کسی رسول کا عمل بھی اس طریقہ کے خلاف نہیں ہوا۔ ٹھیک اسی مقصد کے لیے عیسیٰ ابن مریمؑ کی بھی بعثت ہوئی اور انھیں انجیل عطا کی گئی۔ وہ لوگوں کو رہبانیت کی تعلیم دینے کے لیے نہیں بھیجے گئے تھے۔ بس یہ بات تھی کہ ان کے پیرؤوں میں رافت و رحمت کا جذبہ اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر رکھا تھا۔ اسی کا سہارا لے کر بعد کے مبتدعین نے رہبانیت کا ایک نظام کھڑا کر دیا حالانکہ ان پر رہبانیت نہیں فرض کی گئی تھی بلکہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی فرض کی گئی تھی لیکن انھوں نے اس کے حدود ملحوظ نہیں رکھے بلکہ فطرت و شریعت کے حدود توڑ کر بالکل دوسری وادیوں میں بھٹک گئے۔

اس سے یہ حقیقت واضح ہوئی کہ دین میں رہبانیت کی بدعت داخل تو ہوئی ہے نصاریٰ کے ذریعہ سے لیکن اس میں سیدنا مسیحؑ کی تعلیم یا انجیل یا ان کے اصل خلفاء کو کوئی دخل نہیں ہے بلکہ یہ تمام تر بعد کے مبتدعین کی ایجاد ہے۔

وَجَعَلْنَا فِی قُلُوبِ الَّذِینَ اتَّبَعُوہُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً۔ یہ حضرت مسیح علیہ السلام کے اوّلین پیرؤوں کی تعریف فرمائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں رافت و رحمت رکھی تھی۔ اس تعریف سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ ان کی یہی بہترین انسانی اوصاف بعد والوں کے لیے رہبانیت کی دلیل بن گئے حالانکہ رافت و رحمت کی تعلیم جس طرح سیدنا مسیح علیہ السلام نے دی ہے اسی طرح اللہ کے ہر نبی و رسول نے دی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق قرآن میں ارشاد ہے کہ حَرِیصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِینَ رَءُوفٌ رَّحِیمٌ (التوبۃ - ۹: ۱۲۸) (وہ تمھاری ہدایت کا حریص اور مومنین کے لیے نہایت شفیق و مہربان ہے) خود مسلمانوں کے باب میں رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ (آپس میں رحم دل ہیں) کے الفاظ وارد ہوئے ہیں۔ احادیث میں مسلمانوں کے جو اوصاف بیان ہوئے ہیں وہ ان سے زیادہ واضح ہیں۔ فرمایا گیا ہے کہ اہلِ ایمان باہمی ہمدردی و دردمندی میں اس طرح ہیں جس طرح ایک جسم کے اعضا باہم دگر ہوتے ہیں۔ سعدی نے ایک حدیث ہی کا ترجمہ اس طرح کیا ہے ؎

چو عضوے بدرد آورد روزگار　　دگر عضوہا را نماند قرار

رافت و رحمت عدل و قسط کے منافی نہیں ہے بلکہ اس کا اوّلین تقاضا عدل و قسط کا قیام ہی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں قیامت کو، جو عدلِ کامل کے ظہور کا دن ہے، اپنی صفتِ رحمت ہی کا ایک لازمی نتیجہ قرار دیا ہے: کَتَبَ عَلٰی نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَیَجْمَعَنَّکُمْ اِلٰی یَوْمِ الْقِیٰمَةِ (الانعام - ۶: ۱۲) (اللہ نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے، وہ تمھیں قیامت کے دن کے لیے ضرور جمع کر کے رہے گا) سیدنا مسیح علیہ السلام کے پیرؤوں کو چونکہ آپ کی زندگی میں جہاد کا موقع

نہیں ملا اس وجہ سے بعد والوں نے ان کی رافت و رحمت کو رہبانیت کی دلیل بنا لیا۔ حالانکہ انھیں جہاد کا موقع ملا ہوتا، جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کو اس کی سعادت حاصل ہوئی، تو وہ بھی اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ کی تصویر ہوتے۔[1]

رہبانیت بدعت ہے

وَرَھْبَانِیَّۃَ نِ ابْتَدَعُوْھَا مَا کَتَبْنٰھَا عَلَیْھِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰہِ فَمَا رَعَوْھَا حَقَّ رِعَایَتِھَا۔ یعنی ان کے دلوں میں رافت و رحمت تو ہم نے ضرور رکھی لیکن اس کی آڑ میں یہ رہبانیت جو بعد والوں نے ایجاد کی اس کو مسیح علیہ السلام کی تعلیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ رَھْبَانِیَّۃً، جَعَلْنَا کے تحت نہیں ہے۔ اس کا نصب ایک فعل مضمر کے زیر اثر ہے جس کی وضاحت بعد کے فعل اِبْتَدَعُوْھَا سے ہو رہی ہے۔ البتہ یہاں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ رہبانیت کی ایجاد ہوئی تو ایک اچھے محرک سے لیکن ہے یہ خدا کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز، جن لوگوں نے یہ راہ اختیار کی وہ ایک اچھے محرک کے باوجود اپنی بدعت پسندی، غلو اور تشدد کے باعث بالکل غلط راہ پر جا پڑے۔

مَا کَتَبْنٰھَا عَلَیْھِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰہِ۔ یعنی یہ رہبانیت جو انھوں نے اپنے اوپر لادلی یہ ہماری فرض کردہ نہیں ہے بلکہ یہ ان کی اپنی ایجاد کردہ ہے۔ ہم نے ان پر جو چیز فرض کی تھی وہ صرف اللہ تعالیٰ کی رضا طلبی کی جد و جہد تھی۔ اگر یہ رہبانیت اسی حد تک ہوتی تو ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں باعث خیر و برکت ہوتی لیکن انھوں نے اس کے حدود ملحوظ نہیں رکھے۔

فَمَا رَعَوْھَا حَقَّ رِعَایَتِھَا میں ضمیر مؤنث کا مرجع ظاہر ہے کہ رَھْبَانِیَّۃً، ہی ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ رہبانیت کے معاملے میں نصاریٰ کی اصل غلطی یہ ہے کہ انھوں نے اس کے حدود کما حقہٗ ملحوظ نہیں رکھے جس کے سبب سے اس میں فطرت اور عقل کے خلاف باتیں داخل ہو گئیں۔ اگر وہ اس کے حدود ملحوظ رکھتے تو ابتغاء رضوان اللہ کے نصب العین سے یہ تجاوز نہ ہوتی اور یہ چیز ایسی ہے جو تمام انبیاء اور تمام آسمانی صحیفوں کی تعلیم میں مشترک ہے اور اللہ کی راہ میں جہاد اور جنگ و قتال اس رہبانیت کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت سورۂ توبہ میں یوں فرمائی گئی ہے:

اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ	اللہ نے ایمان والوں سے ان کی جانیں اور ان
اَنْفُسَھُمْ وَاَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ	کے مال جنت کے عوض میں خرید لیے ہیں۔ وہ

[1] جہاد کے باب میں سنت الٰہی کی وضاحت اس کتاب میں جگہ جگہ ہو چکی ہے۔

يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ	اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں، پس قتل کرتے بھی
فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَيْهِ	ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں۔ یہ اللہ کے ذمہ قطعی
حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ	وعدہ ہے، تورات، انجیل اور قرآن
وَالْقُرْاٰنِ ط (التوبۃ-۹: ۱۱۱)	سب میں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کی رضا طلبی کے لیے جنگ و قتال تمام انبیاء اور تمام آسمانی صحیفوں کی مشترک تعلیم ہے۔ یہی تعلیم نصاریٰ کو انجیل میں بھی دی گئی تھی اس لیے کہ انجیل میں درباب احکام تورات کی پوری پابندی کی بار بار تاکید کی گئی ہے لیکن انھوں نے ایک ایسی رہبانیت ایجاد کر لی جس میں یہ اصل نصب العین غائب ہو گیا۔

یہاں ایک اور حقیقت بھی ذہن میں از سر نو تازہ کر لیجیے جس کی طرف سورۂ توبہ کی تفسیر میں لفظ 'سائحون' کے تحت، ہم توجہ دلا چکے ہیں کہ رہبانیت اور سیاحت[1] وغیرہ کے باب میں ہمارے ہاں منفی اور مثبت دونوں ہی طرح کی باتیں ملتی ہیں۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بجائے خود مطعون چیزیں نہیں ہیں بلکہ ان میں خرابی ان کے حدود کی حفاظت نہ کرنے کے سبب سے پیدا ہوتی ہے، جیسا کہ قرآن نے 'فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا' کے الفاظ سے اشارہ فرمایا ہے۔ چنانچہ اسلام نے سیاحت و رہبانیت کے وہ تمام اجزاء اپنے نظام میں داخل کر لیے ہیں جو فطرت کے موافق اور ابتغائے رضوان اللہ کے نصب العین سے ہم آہنگ ہیں البتہ وہ چیزیں اپنے نظام سے خارج کر دی ہیں جو مبتدعین نے عقل و فطرت کے خلاف ایجاد کی ہیں۔ اسلام کے نظام عبادت پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نماز، روزہ، حج، انفاق ہر عبادت کے اندر رہبانیت کے صالح اجزاء موجود ہیں۔ یہاں تک کہ بعض احادیث میں جہاد کو بھی رہبانیت کہا گیا ہے۔

سچے نصاریٰ کی تعریف

'فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ'۔ قرینہ دلیل ہے کہ فعل 'اٰمَنُوْا' یہاں اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے۔ یعنی حضرت مسیح کے نام لیواؤں میں سے جو لوگ حضرت مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیم پر استوار اور ثابت قدم رہے ان کو تو ہم نے ان کے حصہ کا وہ اجر دیا جس کے وہ سزاوار ٹھہرے لیکن ان کی اکثریت نافرمان ہی نکلی جو اپنے کیفر کردار کو پہنچی۔ یہاں 'الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا' سے مراد ظاہر ہے کہ حضرت مسیح کے سچے خلیفہ شمعون اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے نصاریٰ ہیں جو ہر قسم کے مخالف حالات کے باوجود اصل دین پر قائم رہے۔ یہاں تک کہ جب اسلام کی دعوت بلند ہوئی تو یہی بقیۃ السلف کے صالحین تھے جنھوں نے نہایت دلی جوش

---

[1] یہ لفظ میں نے یہاں معروف لغوی معنی میں نہیں بلکہ اصطلاحی معنی میں استعمال کیا ہے۔

کے ساتھ اس دعوت کا خیر مقدم کیا۔ قرآن نے متعدد مقامات پر نہایت شاندار الفاظ میں ان لوگوں کی حق پرستی کی تعریف کی ہے۔

'وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ فَاسِقُونَ' سے اشارہ پال اور اس کے پیروؤں کی طرف ہے جنھوں نے تثلیث اور رہبانیت کی بدعتیں ایجاد کر کے دینِ مسیحی کا حلیہ بگاڑا اور رومیوں کی تمام ضلالتیں اپنے دین میں گھسا دیں۔ بعد میں منافقین و مضلین کے اسی گروہ کو اکثریت حاصل ہو گئی یہاں تک کہ اصل نصرانیت کے جاننے اور ماننے والے بہت تھوڑے رہ گئے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَآمِنُوا بِرَسُولِهِ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِن رَّحْمَتِهِ وَيَجْعَل لَّكُمْ نُورًا تَمْشُونَ بِهِ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (۲۸)

سچے نصاریٰ کو دعوتِ ایمان

یہاں 'الَّذِينَ آمَنُوا' سے خطاب انہی نصاریٰ سے ہے جن کا ذکر اوپر والی آیت میں 'فَآتَيْنَا الَّذِينَ آمَنُوا مِنْهُمْ أَجْرَهُمْ' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ جب بات ان کے ذکر تک پہنچ گئی تو انہی کے حوالہ سے ان نصاریٰ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت دے دی گئی جن کے اندر ایمان کی رمق موجود تھی۔ ان کو خطاب کر کے فرمایا کہ اے لوگو جو ایمان لائے (یعنی مسیح پر ایمان لائے) اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاؤ تو خدا تم کو اپنی رحمت میں سے دو حصے دے گا اور تمھارے لیے ایک نور نمایاں فرمائے گا جس کو لے کر تم آخرت میں چلو گے اور اللہ تمھاری مغفرت فرمائے گا۔ وہ بڑا ہی غفور رحیم ہے۔

سورۂ مائدہ میں نصاریٰ کے ایک گروہ کی تعریف ان الفاظ میں آئی ہے:

لَتَجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً	تم اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ سخت
لِّلَّذِينَ آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ	یہود اور مشرکینِ قریش کو پاؤ گے اور اہلِ ایمان کی
أَشْرَكُوا ۖ وَلَتَجِدَنَّ أَقْرَبَهُم	دوستی میں سب سے زیادہ قریب ان لوگوں کو پاؤ گے
مَّوَدَّةً لِّلَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ	جو کہتے ہیں کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ بات اس وجہ سے
قَالُوا إِنَّا نَصَارَىٰ ۚ ذَٰلِكَ	ہے کہ ان کے اندر علما اور راہب موجود ہیں اور
بِأَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيسِينَ وَرُهْبَانًا	یہ لوگ استکبار میں مبتلا نہیں ہیں۔ یہ لوگ جب
وَأَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۝ وَإِذَا	اس کلام کو سنتے ہیں جو رسول پر اتارا گیا ہے تو اس
سَمِعُوا مَا أُنزِلَ إِلَى الرَّسُولِ	حق کو پہچان لینے کے سبب سے جو اس کے اندر
تَرَىٰ أَعْيُنَهُمْ تَفِيضُ مِنَ الدَّمْعِ	موجود ہے ان کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو
مِمَّا عَرَفُوا مِنَ الْحَقِّ ۖ يَقُولُونَ	جاتی ہیں۔ وہ پکار اٹھتے ہیں کہ اے رب، ہم
رَبَّنَا آمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشَّاهِدِينَ ۝	ایمان لائے تو ہمیں آخری رسول کی گواہی دینے

(المائدۃ ۵: ۸۲ - ۸۳)   والوں میں لکھ۔

آیت زیرِ بحث میں ان تمام نصاریٰ کو جن کے اندر ایمانِ سابق کی رمق باقی ہے نبی امی پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے کہ اللہ سے ڈرو اور اس کے اس رسول پر ایمان لاؤ جس کی بشارت دینے پر تم مامور کیے گئے تھے۔ اللہ سے ڈرنے کی تنبیہ اس لیے فرمائی گئی ہے کہ بہت سے نصاریٰ یہ سمجھتے تو تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی امی ہیں جن کی پیشین گوئی انجیل میں وارد ہے لیکن اسلام کے خلاف خاکبازی کرنے والوں سے یہ لوگ ڈرتے تھے کہ اگر انھوں نے اس حق کا اعتراف کر لیا تو یہ سارے لوگ ان کے دشمن بن جائیں گے۔ ان کے اس اندیشے کی بنا پر متنبہ فرمایا کہ لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ صرف اللہ سے ڈرو۔ لوگوں کے ڈر سے تم نے اللہ کے ڈر کو نظر انداز کر دیا تو اس کے انجام کو اچھی طرح سوچ لو۔

دوہرے اجر کا وعدہ

'یُؤۡتِکُمۡ کِفۡلَیۡنِ مِنۡ رَّحۡمَتِہٖ'۔ یہ اس وعدے کا اعادہ ہے جو سچے اور راست باز اہل کتاب کے لیے سورۂ قصص میں مذکور ہوا ہے۔ وہاں فرمایا گیا ہے کہ اہل کتاب میں سے جو اپنے دین پر بھی استوار رہے اور جب ان کے صحیفوں کی پیشین گوئیوں کے مطابق ان کے پاس اللہ کا آخری رسول آیا تو انھوں نے اس کے موعود اور برحق ہونے کی بھی گواہی دی تو ان کو ان کا اجر دہرا ملے گا اس لیے کہ انھیں حق کی گواہی دینے کے لیے دو کڑے امتحانوں سے گزرنا پڑا اور وہ دونوں امتحانوں میں کامیاب رہے۔ فرمایا ہے:

اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ مِنۡ قَبۡلِہٖ ہُمۡ بِہٖ یُؤۡمِنُوۡنَ ○ وَ اِذَا یُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ قَالُوۡۤا اٰمَنَّا بِہٖۤ اِنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّنَاۤ اِنَّا کُنَّا مِنۡ قَبۡلِہٖ مُسۡلِمِیۡنَ ○ اُولٰٓئِکَ یُؤۡتَوۡنَ اَجۡرَہُمۡ مَّرَّتَیۡنِ بِمَا صَبَرُوۡا وَ یَدۡرَءُوۡنَ بِالۡحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ وَ مِمَّا رَزَقۡنٰہُمۡ یُنۡفِقُوۡنَ ○	جن کو ہم نے اس (قرآن) سے پہلے کتاب عطا فرمائی وہی اس (قرآن) پر ایمان لانے والے بنیں گے۔ اور جب یہ ان کو سنایا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں ہم اس پر ایمان لائے۔ بے شک یہ ہمارے رب ہی کی طرف سے ہے اور ہم پہلے سے اس کے ماننے والے رہے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن کو ان کا اجر دو مرتبہ ملے گا بوجہ اس کے کہ وہ ثابت قدم رہے اور لوگوں کی ایذا رسانیوں کو اچھے سلوک سے دفع کرتے اور ہمارے بخشے ہوئے رزق میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہے۔
(القصص ۲۸: ۵۲-۵۴)	

سورۂ قصص کی تفسیر میں ہم نے واضح کیا ہے کہ 'اَلَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ' سے اچھے اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ کے اس گروہ کی طرف اشارہ ہے جس کی حق دوستی اور خشیتِ رب کا ذکر

سورۂ مائدہ کی محولہ بالا آیت میں ہوا۔

یہ امر یہاں واضح رہے کہ اہل کتاب کے صالحین کو دُہرا اجر پانے کا یہ شرف اس بنا پر نہیں حاصل ہوگا کہ وہ اہل کتاب میں سے ہیں بلکہ اس وجہ سے ہوگا کہ انھوں نے اس حق کی بھی گواہی دی جو حضرت مسیح علیہ السلام اور سابق نبیوں پر نازل ہوا اور اس حق کی بھی شہادت دی جو نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا۔ یہ امت چونکہ اس تمام حق کی بلا کسی تفریق و تحزب کے گواہی دینے والی ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے، خواہ وہ سابق انبیائے کرام پر نازل ہوا یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا، اس وجہ سے یہ دہرا اجر پانے کی حق دار ہے۔ چنانچہ جو لوگ بھی اس امت میں داخل ہوں گے وہ اس شرف سے بہرہ مند ہوں گے۔ احادیث میں اس کی وضاحت ہوئی ہے لیکن اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس وجہ سے ہم زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔

وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ۔ یہ اسی طرح کی بشارت ہے جس طرح کی بشارت اسی سورہ کی آیت ۱۲ میں بدیں الفاظ گزر چکی ہے: يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ يَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (جس دن تم مومن مردوں اور مومنہ عورتوں کو دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے آگے اور ان کے دائیں چل رہا ہوگا) وہی بشارت ان صالحین کو بھی دی گئی ہے کہ ان کو اللہ نے ایمان کی جو روشنی دی تھی اس کی انھوں نے حفاظت کی، اس سے خود بھی رہنمائی حاصل کی اور اللہ کے دوسرے بندوں کو بھی راہ دکھائی۔ اس کے صلے میں ان کو آخرت میں ایک نور عطا ہوگا جس کو اس دن کے اندھیرے میں یہ لے کر چلیں گے اور وہ سارے لوگ اس سے کسبِ نور کریں گے جنھوں نے دنیا میں ان کا ساتھ دیا ہوگا۔

لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۲۹)

یہود کے حسد کی طرف اشارہ

یہ ان لوگوں کو ابھارا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے اس فضل عظیم کے حاصل کرنے کے لیے سبقت کرو اور حاسد یہود کو چھوڑو، وہ نبی امی اور ان پر ایمان لانے والوں کے خلاف حسد کی جس آگ میں جل رہے ہیں اسی میں جلتے رہیں۔ ان کے اس حسد کا سبب ان کی یہ جہالت ہے کہ وہ اللہ کے تمام فضل کا اجارہ دار اپنے کو سمجھتے ہیں۔ ان پر یہ حقیقت واضح نہیں ہوئی کہ اللہ کے فضل کے مالک وہ نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل کا مالک خود ہے۔ وہ اس کو بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے اور وہ بڑے فضل والا ہے، جس کو چاہے بخش دے۔

'اَهْلُ الْكِتٰبِ' اگرچہ باعتبار الفاظ عام ہے، یہود و نصاریٰ دونوں ہی اس سے مراد ہو سکتے ہیں۔ لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اس سے مراد یہود من حیث الجماعت ہیں اس لیے کہ وہی

اللہ تعالیٰ کے تمام فضل و انعام کے وارث و مورث ہونے کے خبط میں مبتلا تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ ان سے باہر نہ کسی کو نبوت و رسالت مل سکتی اور نہ ان کے سوا کوئی خدا کے ہاں کسی اجر اور فضل کا حق دار ہے چنانچہ اپنے اسی پندار کے سبب سے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعوائے رسالت کے شدید مخالف تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ ان کی مخالفت کے علی الرغم یہ دعوت برابر بڑھتی جا رہی ہے یہاں تک کہ ان کی اپنی صفوں کے اندر سے بھی بہت سے اخیار ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے جاں نثار بنتے جا رہے ہیں تو ان پر حسد کا ایسا بخار چڑھا کہ بالآخر وہ ان کو ہلاک کر ہی کے اترا۔ اس حسد کے اسباب اور اس کے اثرات و نتائج پوری تفصیل سے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان ہو چکے ہیں۔

'لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ ..... الاية' سے مراد یہاں یہود کی اس جہالت و حماقت کے لازمی نتیجہ یعنی برابر مبتلائے حسد رہنے کی طرف اشارہ کرنا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس حسد میں اس وجہ سے مبتلا تھے کہ وہ اپنے کو اللہ کے تمام فضل و انعام کا پشتینی حق دار اور اجارہ دار سمجھے بیٹھے تھے۔ اگر وہ اس حماقت میں مبتلا نہ ہوتے بلکہ اس حقیقت کو جانتے ہوتے کہ نبوت و رسالت اور سیادت و امامت اللہ تعالیٰ کا عطیہ ہے، وہ جس کو چاہے بخشے تو ان کے لیے کسی غصہ اور حسد میں مبتلا ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ وہ سمجھ سکتے تھے کہ اب تک اللہ نے اس منصب پر ان کو سرفراز رکھا، اب اگر وہ اس کے لیے کسی دوسرے کو منتخب کر رہا ہے تو کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا اور ان کی سعادت اب حسد اور مخالفت میں نہیں بلکہ اپنے رب کے فیصلہ کو قبول کر لینے میں ہے لیکن وہ برابر اپنے اسی خبط میں مبتلا رہے جس میں مبتلا تھے جس کا لازمی نتیجہ یہ بھی نکلا کہ وہ جس حسد و بغض کی آگ میں جل رہے تھے وہ برابر تیز سے تیز تر ہی ہوتی گئی۔ گویا اصل بات جو یہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی دعوت کے ساتھ فرمائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ایمان لانے والے اللہ کے آخری رسول پر ایمان لا کر اپنے کو دہرے اجر کا حق دار بنائیں اور ان حاسد یہودیوں کو ان کے حال پر چھوڑیں، وہ برابر اپنے حسد کی آگ میں جلتے رہیں۔ اس بات کے بیان کرنے کے لیے اسلوب یہ اختیار فرمایا گیا ہے کہ یوں کہنے کے بجائے کہ ان یہودیوں کو ان کے حسد میں جلنے مرنے دو، تم اپنے آپ کو اپنے رب کے دہرے اجر کا حق دار بناؤ، بات یوں فرمائی گئی کہ یہود کو ان کی اس جہالت میں مبتلا رہنے دو کہ وہ اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی تمام سرفرازیوں کا حق دار سمجھتے ہیں حالانکہ یہ محض ان کی حماقت ہے اور یہی حماقت ان کے سارے رنج و حسد کا سبب ہے۔

اس اسلوب میں بات کہنے کا فائدہ یہ ہوا کہ یہود کی اصل بیماری بھی واضح ہو گئی اور اس کا اصل سبب بھی معلوم ہو گیا اور کلام میں کوئی تلخی بھی پیدا نہیں ہونے پائی۔

اس سورہ کی ان آخری آیات کی تاویل میں ہمارے مفسرین کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ اگر ان

کے اقوال نقل کر کے ہم ان پر تنقید کرتے تو اس میں بڑی طوالت ہوتی جس کا کچھ خاص فائدہ نہیں تھا۔ اس وجہ سے زبان، نظام اور نظائرِ قرآن کی روشنی میں ہمارے نزدیک جو تاویل صحیح ہے وہ ہم نے بیان کر دی ہے۔ امید ہے کہ تدبر کرنے والوں کو اس سے اطمینان ہو جائے گا۔

یہاں خاص طور پر زبان اور اسلوب سے متعلق دو باتیں پیش نظر رکھیے:

زبان کا ایک اسلوب

ایک یہ کہ بعض مرتبہ کلام میں مدنظر ظاہر کلام نہیں بلکہ اس کا نتیجہ ہوتا ہے۔ مثلاً یہ جو فرمایا کہ تاکہ اہل کتاب نہ جانیں کہ وہ اللہ کے فضل میں سے کسی چیز پر کوئی اختیار نہیں رکھتے، تو مقصود اس سے اس کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی اس جہالت کے لازمی نتیجہ یعنی فضل والوں پر حسد میں مرتے رہیں۔

دوسری یہ کہ حرف 'لَا' نہ یہاں زائد ہے اور نہ قرآن میں اس کے زائد ہونے کی کوئی مثال موجود ہے بلکہ جیسا کہ ہم اس کے محل میں واضح کر چکے ہیں، یہ ان حروف میں سے ہے جن کو زائد ماننے کی گنجائش کسی شکل میں نہیں ہے۔ ورنہ اس سے مفسدین اور اہلِ بدعت کے لیے دین میں فتنے پیدا کرنے کی راہیں کھل جائیں گی البتہ کبھی کبھی بنظرِ احتیاط تاکید کے لیے یہ دہرا دیا جاتا ہے اور یہ بات زبان کے معروف قاعدے کے مطابق ہوتی ہے جس کی مثالیں قرآن اور کلامِ عرب میں بہت ہیں، مثلاً 'مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ' (الاعراف ۷: ۱۲) یا 'وَحَرٰمٌ عَلٰى قَرْيَةٍ أَهْلَكْنٰهَا أَنَّهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ' (الانبیاء ۲۱: ۹۵) وغیرہ۔

اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ان سطور پر اس سورہ کی تفسیر تمام ہوئی۔ فَالْحَمْدُ لِلّٰهِ عَلٰى ذٰلِكَ۔

رحمان آباد

۱۵۔ دسمبر ۱۹۷۷ء

۴۔ محرم الحرام ۱۳۹۸ھ